کارنامے نواب تیس مار خاں کے

ابنِ انشا



کارنامے نوّاب تیس مار خان کے



جرمنی کے مشہور افسانوی کردار

دنیا کے سب سے بڑے گپ باز

معلّی القاب بیرن منش ہاؤزن کی لن ترانیاں

ابنِ انشا

جون ۱۹۷۱

تصویریں مشہور کارٹونسٹ نجمی کی بنائی ہوئی ہیں

فہرست

ذکر دو موذیوں کی کھٹ پٹ کا 19

جوتنا بھیڑیے کو گاڑی میں 25

بالکل سچّے قصّے شکار کے 30

ہرن رے ہرن تیرے سر پر بیری 35

داستان آدھے گھوڑے کی 39

ماجرا چاند پر چڑھنے اُترنے کا 47

کھیلنا توپ کے گولوں سے 53

چل میرے غبارے 60

توپ اُٹھا کے سمندر میں پھینک دی 63

میں نے قیدی کیسے چھڑائے 66

سوجانا توپ کی نال میں 68

پاتال کی سیر **70**

تعارف

جس طرح ہر ملک اور قوم کی روایات میں ایک نہ ایک بہادر ہیرو اور ایک نہ ایک عاشق ہیرو ہوتا ہے، بلکہ کئی کئی ہوتے ہیں، اسی طرح کوئی نہ کوئی شیخ چِلی، کوئی نہ کوئی ڈان کوئکساٹ، کوئی نہ کوئی مُلّا نصیر الدّین بھی ہوتا ہے۔ ہماری اس کتاب کے ہیرو کا جرمن روایات میں کُچھ اسی قسم کا مقام ہے۔ جرمنی سے نکل کر اس کی شہرت اکناف عالم میں پھیلی اور شاید آپ نے بھی اس کا کوئی نہ کوئی کارنامہ اپنی زبان میں پڑھا ہو گا یا سُنا ہو گا جیسے گھوڑے کے گرجا کی سلاخ سے بندھنے کا واقعہ ہم نے اپنے بچپن میں رسالہ پھول میں پڑھا تھا۔ اس کے لیے کُچھ ضروری نہیں کہ آپ کو بیرن

منش ہاؤزن کا نام بھی یاد ہو۔ ہمارے ممدوح کی شہرت عموماً یہ ہے کہ یہ دُنیا کے سب سے چھوٹے آدمی تھے، ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں۔ کیوں کہ خود اِن قبلہ کو اپنی راست بازی پر اس قدر اصرار ہے کہ کوئی ان کے بیان پر ذرا سی بھی بدگمانی کرے تو مرنے مارنے پر تیّار ہو جاتے ہیں۔ ایک سفر میں تو جس میں یہ زمین کے اس سِرے سے کوہ آتش فشاں کے ایک سوراخ میں داخل ہو کر دوسرے سوراخ سے نکل آئے تھے اور پنیر کے جزیرے کے علاوہ ایک سمندری عفریت کے شکم میں مع اپنے جہاز کے کئی ہفتے رہے تھے۔ ان کا گزر ایک جگہ سے ہوتا ہے جہاں تین آدمیوں کو اُلٹا لٹکا رکھا ہے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ بھئی ان کا جرم؟ معلوم ہوا یہ سیّاح ہیں جو سفر سے آ کر لمبی لمبی ہانکا کرتے تھے۔ ہر بات میں جھوٹ ملاتے تھے۔ ہمارے ممدوح اس پر الحمدﷲ کہتے ہیں کہ خُدا کا شکر ہے میں ایسا نہیں۔ میں نے آج تک صداقت سے سرِ موانحراف نہیں کیا۔

غالباً ان کے اپنے لباس کا پاس کرتے ہوئے جناب ممتاز حسن نے جن کے ایما پر ہم ان حضرت کو اُردُو کا جو تا ٹوپی پہنا رہے ہیں سفارش کی کہ "ان کا نام نوّاب جھوٹے خاں مت رکھو۔ ان کا مقصد کسی کو دھوکا دینا تھوڑی تھا۔ بس ترنگ میں آ کر سبھی سے ایسے ارشادات سرزد ہو جاتے ہیں جن کو عامی لوگ اپنے تجربے سے ذرا دُور کی بات ہونے کے باعث حقیقت سے مختلف سمجھ لیتے ہیں۔ تم بھی سفر نامے لکھتے ہو اور

تمہارا بھی کہنا ہے کہ سبھی کُچھ راست بے کم و کاست لکھتے ہو۔ کوئی تُم پر بھی ایسا گمان لائے تو؟ مثل بھی ہے جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ۔" اچھا کیا کہ جناب ممتاز حسن نے ہمارے سنگ اُٹھاتے ہی ہمیں ہمارا سر یاد دلا دیا۔ ویسے بھی چوں کہ یہ کردار ان کا محبوب کردار ہے۔ اس کتاب کو ان کے نام سے منتسب کر کے ہم اس کے جھوٹ سچ کی بات ان کے (یعنی بیرن منش ہاؤزن کے اور ممتاز صاحب کے) حسابِ دوستاں کے کھاتے میں ڈالے دیتے ہیں۔ اگرچہ اُن کا لقب تیس مار خاں بھی اُن کے سراپا صداقت ہونے کی گواہی نہیں دیتا لیکن اس کی تلافی ہم شروع کتاب میں ایک سرٹیفکیٹ چھاپ کر کر رہے ہیں۔ جس میں مشہور زمانہ سیاحین گلیور اور سندباد اور اللہٰ دین متخلص بہ چراغ نے ہمیں قسمیہ تاکید ہے کہ ان ملفوظات پر ایسے ہی ایمان لانا ہوگا جسے آپ لوگ ہمارے سرگزشتوں پر لاتے ہیں ورنہ ہم سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔ ہر چند کہ اِن صاحبوں نے اپنی حکایات یعنی سرگزشتوں کے ساتھ اس قسم کے صداقت نامے کبھی منسلک نہیں کیے۔ تاہم خطائے بزرگاں گرفتن خطاست، ہمارے لیے نوّاب تیس مار خاں یعنی بیرن منش ہاؤزن بھی سچّے اور یہ حضرات بھی سچے۔

یہ کتاب پہلی بار انگریزی میں چھپی اور انگلستان میں چھپی۔ یہ ۱۷۸۵ء کی بات ہے۔ ایسی مقبول کہ چند ماہ میں چار ایڈیشن نکل گئے۔ پہلے دو ایڈیشن تو اس کتاب کے پہلے

چھ کارناموں پر مشتمل تھے۔ تیسرے ایڈیشن سے اضافہ ہونا شروع ہوا، اور آدھی کتاب کا اضافہ کوئی دو سال بعد ۱۷۸۷ء کے ایڈیشن میں نظر آتا ہے۔ فی الواقع صرف شروع کے چھ قصّے اصل مصنّف نے لکھے تھے باقی وضعی اور جعلی ہیں۔ لوگ اضافہ کرتے گئے جیسے وارث شاہ کی ہیر میں کیا گیا۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کا اعلان برطانوی ماہنامے "کریٹیکل ریویو" کے شمارہ دسمبر ۱۷۸۵ء میں بدیں عنوان چھپا:

"داستان ولایاتِ روس میں بیرن منش ہاؤزن کی حیرت انگیز سیاحتوں اور مہمات کی"

عنوان کے نیچے یہ وضاحت بھی تھی کہ حیرت ناک سفروں اور مہموں پر مشتمل یہ کتاب مستطاب شرفائے ولایت کی نذر ہے۔ وہ چاہیں تو اس میں اپنا نام ڈال کر اِن قصّوں کو شکار یا گھُڑ دوڑ کے موقعوں، گھوڑوں کو پانی پلانے اور دوسری اجتماع کی جگہوں پر یا شراب نوشی کرتے اور آگ تاپتے ہوئے لوگوں کے گوش گزار کر سکتے ہیں۔ وما دعوانا الا البلاغ۔

یہ کتاب جس کا نتیجہ فکر ہے؟ انگریزی کتاب پر کوئی نام نہ تھا۔ جب جرمن شاعر گوٹفرڈ آگسٹ برگر نے ۱۷۸۷ء میں کتاب کی طبع دوم کا جرمن ترجمہ شائع کیا تو اس

پر بھی مصنّف کا نام نہ تھا۔ اگرچہ برگر نے لکھ دیا تھا کہ یہ ترجمہ ہے لیکن لوگ مدّتوں اسی کو مصنّف سمجھتے اور گمان کرتے رہے کہ قارئین کو تفریحاً گمراہ کرنے کے لیے اسے ترجمے کا نام دیا جارہا ہے۔ آخر ۱۸۲۴ء میں مترجم یعنی برگر کے ایک دوست رین ہارڈ نے اس راز پر سے پردہ اُٹھایا کہ اصل مصنّف پروفیسر راسپ ہے جو جرمنی سے بھاگ کر انگلستان چلا گیا تھا۔ اس کا پورانام پروفیسر رڈولف ایرک راسپ تھا۔ یہ شخص ۱۷۳۷ء میں ہنوور میں پیدا ہوا اور گوٹنگن اور لیپزک کی یونیورسٹیوں سے لسانیات اور نیچرل سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۷۶۲ء میں وہ ہنوور کی یونیورسٹی لائبریری میں کلرک مقرّر ہوا اور ۱۷۶۷ء میں کیسل بلاکر کیرولینم میں آثارِ قدیمہ کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پرانے سِکّوں اور نوادرات کے ایک ذخیرے کا منصرم بھی مقرّر ہو گیا۔ ارضیات، معدنیات اور حیوانیات وغیرہ پر اس کے مضامین جو شائع ہوئے تو اُسے رائل سوسائٹی آف لندن کا اعزازی رُکن بھی بنا دیا گیا۔ ۱۷۷۵ء کے لگ بھگ انکشاف ہوا کہ اس کی تحویل میں جو قیمتی تمغات تھے ان میں سے کُچھ اس نے خورد بُرد کر لیے ہیں۔ وہ گرفتار کر لیا گیا لیکن فرار ہو کر انگلستان پہنچ گیا اور باقی عمر جزائر برطانیہ میں گزاری۔ اس جرم کی بِنا پر اُس کو تمام علمی انجمنوں کی رُکنیت سے برطرف کر دیا گیا۔ حتّٰی کہ رائل سوسائٹی آف لندن کی اعزازی رکنیت سے بھی۔ یہاں اس کی معاش کا انحصار مضمون نویسی

پر رہا یا پھر معدنیات کے ماہر کے طور پر۔ اس کے نامہ اعمال میں ایک اور بد عنوانی بھی لکھی گئی۔ ۱۷۸۸ء کے لگ بھگ وہ اسکاٹ لینڈ گیا اور اپنے آقا اور مربّی سر جان سنکلیئر کو ایک قطعہ زمین میں معدنیات کی دریافت کا جھانسہ دیا حالاں کہ یہ اُس نے خود وہاں دبائی تھیں، حقیقت کا انکشاف ہونے پر وہاں سے بھی بھاگا اور آئر لینڈ پہنچا۔ وہیں ۱۷۹۸ء کے اواخر میں اس کا انتقال ہوتا ہے۔

برگر نے جرمن زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے اصل مصنّف کا نام دینا مناسب نہ سمجھا کیوں کہ جرمنی میں اس کی شہرت خراب ہو چکی تھی لیکن خود اس نے ۱۷۸۵ء میں پہلی بار آکسفورڈ سے بیرن منش ہاؤزن کے سفر روش کے کارنامے شائع کیے تو گُم نام شائع کیے۔ بعد میں تحقیق ہوئی تو ثابت ہوا کہ یہ سارے کارنامے اصلاً جرمن زبان میں بالاقساط چھَپ چکے ہیں۔ ۱۷۸۱ء کے ایک رسالے کی اشاعتوں میں پروفیسر راسپ نے وہاں سے ترجمہ کیا۔ گویا یہ جرمنی ہی کا مال تھا جو برگر کے ترجمے کے ذریعے واپس جرمنی پہنچ گیا، جرمن رسالے میں چھپنے سے پہلے بھی یہ کارنامے ہنوور کے نواحات میں لوگوں کی زبان پر رواں تھے اور اُنہیں توپ خانے کے ایک ریٹائرڈ افسر بیرن منش ہاؤزن کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔

بیرن منش ہاؤزن کون تھے؟ یہ ہنوور میں بوڈن ورڈر کے مقام پر ۱۷۲۰ء میں پیدا

ہوئے اور روسی فوج میں توپ خانے کے افسر کے طور پر ۱۷۴۰ء اور ۱۷۴۱ء میں ترکوں کے خلاف لڑے۔ ۱۷۶۰ء میں یہ ریٹائر ہو کر اپنی جاگیر پر آ گئے اور یہاں سے اُن کی داستان سرائی کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاں یاروں کا جلسہ ہوا، فرمائش ہوئی، نوّاب صاحب اپنے کارنامے سنائیں گے۔ پھر دیکھیے اندازِ گُل افشانی گفتار۔ ۱۷۹۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کہتے ہیں پروفیسر راسپ کی کتاب چھپنے سے ان کی جس قسم کی شہرت ہوئی اس پر موصوف ناخوش تھے اور آخر عمر میں چڑ چڑِے ہو گئے تھے۔

کیا یہ ساری داستانیں بیرن منش ہاؤزن کے ذہن کی اختراع تھیں؟ یہ بات بھی نہیں۔ ان کی اصلیں بھی پُرانے اَدب اور پُرانی روایات میں تلاش کر لی گئی ہیں۔ بس بیرن نے ان کو خود سے منسوب کر لیا تھا۔ ایک معاصر شخصیت سے منسوب ہو کر ظاہر ہے ان کے پس منظر میں معاصر واقعات بھی آ گئے۔ مثلاً جبر الٹر کا محاصرہ، تُرکوں سے لڑائی، غبارے کی پرواز، جو فرانسیسی غبارہ بازوں بلنشرڈ اور مونٹ گولفیئر نے اسی زمانے میں اُڑا دیا تھا۔ اس سلسلے میں ہم پھر عرض کر دیں کہ یہ ہم پہلے چھ کارناموں کی بات کر رہے ہیں۔ باقی اضافے دوسروں کے ہیں اور انگلستان ہی میں لوگوں نے کیے ہیں۔ اگرچہ ان کے ماخذ بھی پُرانی کتابیں اور متداول سفر نامے ہیں۔

خیر اب جو بیرن منش ہاؤزن صاحب مشرف بہ اُردُو ہو گئے ہیں، اگر آپ ان کے کارنامہ جات سے محظوظ ہوتے ہیں تو پاک جرمن فورم کے پردھان ممتاز حسن صاحب کو دُعا دیجیے۔ ہاں اُردُو عبارت کی خرابیوں کا ذمّہ دار خاکسار مترجم ہے۔ اس میں ممتاز صاحب کا کوئی دوش نہیں۔ نہ آنجہانی بیرن منش ہاؤزن یعنی مُعلّٰی انقلاب نوّاب تیس مار خاں کا ہے۔

۲۹ اپریل ۱۹۷۱ء

برائے اطلاع عام

ہر گاہ کہ بعض لوگوں نے جو زمرہ متشکّکین سے تعلّق رکھتے ہیں، راقم الحروف کے کارنامہ جات پر گمان اختراعات و لطائف کا کیا ہے، راقم الحروف بعد ادائے فیس مقرّرہ موازی تین شلنگ تحقیق حق اور اثباتِ صداقت کی خاطر سند ذیل اطلاعِ عام کے لیے شائع کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

مخفی نہ باشد کہ راقم الحروف کئی برس سے سرکاری اور نجی زندگی کو خیرباد کہہ چکا ہے اور اُمّیدوار ہے قارئین کرام ازالہ اوہام کے بعد راقم الحروف کو دعائے خیر سے یاد کریں گے۔

صداقت نامہ

ہم دستخطیانِ ذیل کہ ارادت مندانِ قاضی الحاجات و حلقہ بگوشانِ مبلغ علیہ السلام ہیں۔ بہ تصمیمِ قلب تصدیق کرتے ہیں کہ ہمارے دوست عالی جناب معلیٰ القاب نوّاب منش ہاؤزن کے جملہ ملفوظات مستغنی توصیف و تصدیق ہیں جس طرح ہمارے کارناموں کو کہ بظاہر عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں سزاوار اعتبار سمجھا جاتا ہے نوّاب صاحب کے فرمائے ہوئے کو بھی مستند سمجھا جائے۔

دستخط و مہر

لندن بمقام دار القضائے شہر	گلّیور	سفر نامے والے
بتاریخ ۹ نومبر بہ عدم حاضری قاضی شہر	سندباد	الف لیلہ والے
ان کے چپراسی نے تصدیق کی	الہ دین	چراغ والے


مجسمه صداقت

ذکر دو موذیوں کی کھٹ پٹ کا

صاحبو! ابھی میں نے بچپن سے جوانی کی منزل میں قدم نہیں رکھا تھا، بس مسیں بھیگ رہی تھیں کہ شوق نے پردیس کا راستہ دکھایا یعنی سیرِ دُنیا کا سودا سر میں سمایا۔ بابا جان میرے باہر جانے پر راضی نہ ہو رہے تھے حالاں کہ اپنے زمانے میں اُنہوں نے بہت جہاں گردی کی تھی۔ خُدا بھلا کرے ایک عزیز کا جو ننھیالی رشتے سے بھائی ہوتے تھے کہ اِس مُشکل میں آڑے آئے۔ جانے اُنہوں نے کیسے بابا جان کو شیشے میں اُتارا اور یہ بگڑا کام سنوارا۔ بہر حال لنکا جانے کی اجازت مل گئی۔ تنہا تو نہیں، اِن صاحب کے ساتھ۔ لنکا اس لیے کہ اِن صاحب کے ایک چچا وہاں گورنر رہ چکے

تھے۔



ہم شاہی پروانوں سے لیس ہو کر خُدا کا نام لیے ایمسٹرڈیم سے ایک بادبانی جہاز میں بیٹھ گئے۔ شروع میں ہَوا موافق تھی لیکن جب قریب ایک جزیرے کے پہنچے تو ایک طوفان بے محابا نے آلیا۔ صاحبو! یقین کرنا۔ یہ طوفان ایسا زبردست تھا کہ اُس نے کئی کئی سَو من بھاری پیڑ زمین سے اُکھیڑ ہوا میں تِنکے کی طرح اُچھال دیے۔ زمین سے کوئی پانچ میل اُونچے تو پہنچ ہی گئے ہوں گے۔ لیکن اَچنبھے کی بات یہ دیکھی کہ طوفان تھمتے ہی یہ اپنی اپنی جگہ پر آ کر اِسی طرح گڑ گئے جیسے پہلے تھے۔ ہاں ایک تن آور درخت کے ساتھ یہ ہوا کہ طوفان آنے کے وقت ایک میاں بی بی اُس پر چڑھے ککڑیاں کھیرے اکٹھے کر رہے تھے۔ اس جزیرے میں یہ پیڑوں پر ہی اُگتے ہیں۔

جب یہ درخت زمین کی طرف پلٹا تو ان میاں بی بی کے بوجھ کے باعث ایک طرف کو اُلار ہو گیا اور اس جزیرے کے حاکم کے سر پر اِس طرح گرا کہ اُس کو زمین میں دھانس دیا۔ یہ شخص چھت گر جانے کے خوف سے گھر سے نکل کر بغیچے میں آ گیا تھا۔ یہ بھی اچھّا ہی ہوا کیوں کہ یہ بلا کا لالچی اور نابکار آدمی تھا۔ خلقت کی جان اُس کے ہاتھوں اجیرن تھی۔ اُس نے لوگوں کو لُوٹ لُوٹ کر کنگال کر دیا تھا اور اپنے کوٹھے بھر لیے تھے۔

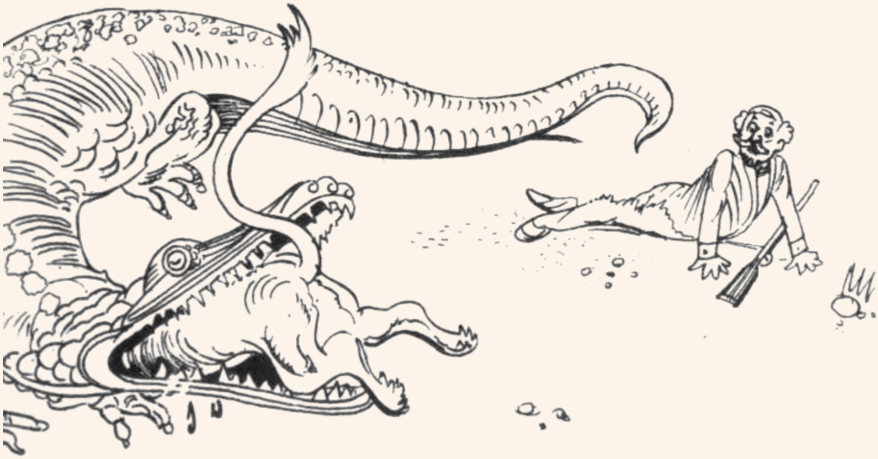
ہر چند کہ اِس ظالم کا مرنا امرِ اتّفاق تھا لیکن جزیرے والوں نے شکرانے میں ان میاں بیوی کو اپنا سردار بنالیا۔

کُچھ ٹوٹ پھوٹ اِس طوفان میں ہمارے جہاز کی بھی ہوئی۔ جب اُس کی مرمّت ہم نے کرلی تو آگے کے لیے بادبان کھولے اور لنگر اُٹھایا۔ چلتے چلتے کوئی چھ ہفتے کے سفر کے بعد ہم لنکا کے ساحل پر جا اُترے جہاں لوگوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی عزّت و تکریم کی۔

اب صاحبو! ایک واقعہ اِس دیس کا بھی سُنو۔ ایک روز کی بات ہے میں وہاں کے راجہ کے بھائی کے ساتھ، کہ میرا دوست بن گیا تھا اور مضبوط کسرتی بدن کا آدمی تھا، شکار کو نِکلا۔ وہ تو راستے جانتا تھا قدم مارتا جنگل میں دُور نکل گیا۔ میں پیچھے رہ گیا۔ گرمی

بہت تھی۔ پانی کے ایک تالاب کو دیکھ کر جی چاہا کہ ڈُبکی ماروں، اتنے میں ایک خوف ناک غرّاہٹ سُنائی دی۔ پیچھے مُڑ کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا شیر آنکھیں انگارہ سی چمکتی، چلا آرہا ہے اور اِرادہ اُس کا میرے ناتواں جسم پر ضیافت اُڑانے کا ہے، وہ بھی میری اجازت کے بغیر۔ اے صاحبو! اور کوئی ہوتا تو اَوسان خطا ہو جاتے۔ لیکن میں نے ایسے شیر بہت دیکھے تھے۔ اس وقت میری بندوق میں مُرغابیاں مارنے کے چھرّے بھَرے تھے۔ ان سے شیر کو مارنے کا تو کیا سوال تھا ہاں ڈرانے اور گھائل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ میں نے یہ بھی پروانہ کی کہ وہ نشانے کی زَد میں ہے یا نہیں اور جھَٹ سے فیر کر دیا۔ اب تو وہ درندہ اور بھی آگ بگولا ہو گیا اور پچھلی ٹانگوں پر الف ہو کر جھپٹنے کو آمادہ ہوا۔ میں نے پلٹ کر بھاگنے کا اِرادہ کیا لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ایک پہاڑ سا مگر مچھ مُنہ پھاڑے کھڑا ہے اور مُجھے لُقمہ بنانے کو ہے۔ داہنے ہاتھ کی طرف وہ تالاب جس کا میں نے ذکر کیا اور بائیں ہاتھ ایک اتھاہ کھڈ جس میں بعد کو معلوم ہوا کہ زہریلے سانپوں سنپولیوں کا مسکن تھا۔ یعنی بچاؤ کا راستہ کسی طرف نہ تھا۔ میں نہ جانے کیسے زمین پر ِگر گیا اور شدنی کا انتظار کرنے لگا۔ جب بہت دیر تک کُچھ نہ ہوا تو سر اُٹھایا۔ ایک طرف سے کڑ کڑ کی آواز آرہی تھی۔ حیران کہ کیا آواز ہے اور کہاں سے آرہی ہے۔ صاحبو! میں نے جو کُچھ دیکھا آپ لوگ یقین نہ کریں گے۔ ماجرا یہ سمجھ میں آیا کہ جُونہی میں ِگرا شیر نے جست لگائی

اور سیدھا مگرمچھ کے کھُلے مُنہ میں جابراجا۔



شیر کا سر گھڑیال کے حلق میں بوتل کے ڈاٹ کی طرح پھنس گیا اور اب دونوں ایک دوسرے سے الگ ہونے کے لیے زور مار رہے تھے۔ خوش بختی سے میرا شکاری چاقو میرے پاس تھا۔ میں نے ایک ہی وار سے شیر کا سر دَھڑ سے جدا کر دیا۔ دَھڑ میرے قدموں میں آ رہا تھا اور مگرمچھ دَم گھُٹ جانے سے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

میرے دونوں مُوذی دُشمنوں کو کیفرِ کردار کو پہنچے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میرا ساتھی بھی مجُھے ڈھونڈتا آنکلا۔ ہم نے مگرمچھ کو ناپا۔ پورے چالیس فٹ لمبا تھا۔ راجا نے اپنے آدمی ایک گاڑی کے ساتھ بھیجے اور وہ دونوں لاشے اُٹھا لے گئے۔ شیر کی

کھال کے میں نے بٹوے بنوائے اور ہالینڈ واپس آکر رؤسا شہر کی نذر کیے۔ اُنہوں نے بہت اصرار کر کے مُجھے اِس کے صلے میں ہزار روپے قبول کرنے پر راضی کیا اور مگرمچھ کی کھال بھُس بھر کر ایمسٹرڈم کے بڑے عجائب گھر میں رکھ دی گئی۔

صاحبو۔ یہ مگرمچھ اب بھی ایمسٹرڈم کے بڑے عجائب گھر میں تماشا گاہِ خاص و عام ہے اور وہاں کا گائیڈ لوگوں کو یہ داستانِ عجیب نمک مرچ لگا کر سناتا ہے۔ اس کی بعض باتیں تو سراسر گھڑنت ہیں مثلاً یہ بیان کرنا کہ شیر پورے کا پُورا مگرمچھ کے شِکم میں چلا گیا تھا اور پچھلے راستے سے نکلنے کو تھا کہ نوّاب صاحب نے یعنی میں نے چاقو کے ایک وار سے اُس کا سر قلم کر دیا اور اِس کے ساتھ ہی مگرمچھ کی تین فٹ دُم بھی۔ یہ جھوٹا کبھی کبھی تو یہ ٹکڑا بھی لگاتا ہے کہ جُونہی مگرمچھ نے اپنی دُم کو کٹتے دیکھا، چاقو نوّاب صاحب کے ہاتھ سے جھپٹ کر نِگل گیا۔ اِس چاقو نے اندر جا کر اُس کے دِل کو چھلنی کیا اور وہ مر گیا۔

اس ناہنجار گائیڈ کے صداقت سے پہلو تہی کرنے سے مُجھے کبھی کبھی خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اُس کی زٹلوں کے ساتھ پورے واقعہ ہی کو مشکوک نہ سمجھنے لگیں حالاں کہ اے صاحبو! اِس میں ایک لفظ جھوٹ کا نہیں۔ سراسر صحیح ہے اور سَر بسر سچ۔

جوتنا بھیڑیے کو گاڑی میں

حضرات ! ایک سال جاڑوں کے دِن تھے کہ میں روم کے شہر سے روس کو روانہ ہوا۔ جاڑوں میں اِس خیال سے کہ برفوں نے سڑکوں کی مرمّت کر دی ہو گی جو ویسے اِن اَطراف میں بہت خستہ اور خراب بتائی جاتی تھیں۔ میں گھوڑے پر تھا اور تنہا۔ کپڑے بھی کُچھ بھاری لے کر نہ چلا تھا اِس لیے جلد ہی سردی نے ستانا اور لہرادِ کھانا شروع کیا۔ برفانی ہوا تیر کی آتی تھی اور جسم کے پار ہو جاتی تھی۔ چلتے چلتے پولینڈ کا ملک آ گیا۔ ایک جگہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بے چارا فلاکت کا مارا سڑک کنارے بے حال پڑا ہے اور ٹھٹھرنے سے اَدھ موا ہے کیوں کہ بدن پر اس کے چند

چیتھڑوں کے سوا کُچھ نہ تھا۔ مجُھے ترس جو آیا تو اپنا چوغہ اُتار اُس پر ڈال دیا۔ یکا یک آسمان سے ایک ملکوتی صدا آئی کہ اے شخص تُجھے اس نیکی کا صلہ ملے گا۔

خیر صاحبو! میں چلتا گیا، چلتا گیا حتّٰی کہ جھٹ پٹا ہو گیا۔ دُور دُور کوئی بستی دِکھائی نہ دیتی تھی اور سڑک کا نشان نہ تھا کہ کہاں سے کہاں نہیں ہے۔ ناچار گھوڑے سے اُترا۔ ایک کھونٹا برف میں گڑا نظر آیا۔ گھوڑے کو تو اُس سے باندھا اور خود وہیں برف پر دراز ہو گیا۔ ایسا سویا کہ صُبح ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو ہر طرف اُجالا پھیل رہا تھا۔ اب جو دیکھا تو یہ جگہ ہی اور تھی۔ ایک گاؤں تھا اور ایک گرجا تھا جس کے صحن میں مَیں لیٹا ہوا تھا۔ حیران کہ کہاں سے کہاں آ گیا اور گھوڑا میرا کہاں ہے۔ یکا یک ایک آواز آئی جو گھوڑے کے ہنہنانے کی تھی۔ لیکن ایسا لگتا تھا اوپر آسمان کی طرف سے آرہی ہو۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہوں کہ گھوڑا گرجا کی چوٹی کی سلاخ سے بندھا لٹکا ہوا ہے۔ غور کیا تو معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ برف نے پورے گاؤں کو ڈھانپ رکھا تھا بلکہ گرجا کی چوٹی کو بھی۔ اس کی پھننگ تھوڑی باہر تھی جسے میں کھونٹا سمجھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اُسے کیسے اُتارا جائے۔ میں نے گھوڑے کی رسّی پر پستول داغا۔ رسّی کٹ گئی اور گھوڑا نیچے آ رہا۔ اب میں آگے سفر پر روانہ ہو گیا۔



چلا چل، چلا چل، روس کے اندر پہنچ گیا۔ یہاں برفانی جاڑوں میں گھوڑے کی بجائے برف گاڑی نے سفر کا رواج ہے۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ میں نے بھی ایک برف گاڑی لی اور سینٹ پیٹرز برگ کا رُخ کیا۔ راستے میں ایک جگہ پیچھے کُچھ آہٹ پا کر ٹھٹکا۔ ایک خوف ناک بھیڑیے کو دیکھا جو اِس سُنسان جنگل میں میرا پیچھا کر رہا تھا۔۔ اور بھوک سے بالکل دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھنے مجُھے آلیا۔ میں برف گاڑی میں دُبک گیا اور گھوڑے کے چابک رسید کیا کہ سلامت نکال لے جائے۔

عین اس لمحے میں بیچ میں سے ہٹا اُس بھیڑیے نے گھوڑے پر جست کی اور اپنے دانت اُس کے جسم میں گڑو دیے۔ وہ اُس کی پیٹھ سے چمٹا اُس کا گوشت پیٹ میں اُتارے جا رہا تھا اور تھوتھنی اندر ہی اندر اُس کے جسم میں گھسیڑے جا رہا تھا۔ گھوڑے نے درد کے مارے اور تیز دوڑنا شروع کیا۔ میں نے سَر اُٹھا کر دیکھا تو بھیڑیا گھوڑے کے جسم میں آدھا دھنس چکا تھا۔ میں نے اپنا چابک اُٹھایا اور تڑ اتڑ اُسے مارنا شروع کیا۔ بھیڑیا گھبر ایا لیکن پیچھے تو نہیں آ سکتا تھا۔ آگے ہی آگے گھوڑے کے جسم میں سُرنگ بناتا گھُستا چلا گیا۔ حتّٰی کہ گھوڑے کا چمڑا اور ہڈّیاں وغیرہ تو زمین پر آ رہی ہیں اور بھیڑیے کی گردن اُس کی جگہ طوق میں پھنس گئی۔

میں نے چابک کی تڑاتڑ جاری رکھی اور بھیڑیے کو دوڑاتا گیا۔ سینٹ پیٹرز برگ والوں کی حیرانی کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں جنہوں نے پہلے کہاں کسی بھیڑیے کو برف گاڑی میں جُتا دیکھا ہو گا؟

بالکل سچّے قصّے شکار کے

صاحبو! یہ واقعہ جو میں سُنانے والا ہوں میرے الھڑ پنے کے دِنوں کا ہے۔ ابھی میں فوج میں نہ گیا تھا، بالکل آزاد تھا۔ جہاں چاہوں جاؤں، جو چاہوں کروں۔ آج بھی وہ مزے کے دِن یاد آتے ہیں۔ خیر ایک بار میں یاروں کے ساتھ سیر و شکار کو نکلا اور جنگل میں ایک جھونپڑے میں جا بسیرا کیا۔ جھونپڑے کے باہر ایک جوہڑ تھا۔ ایک روز صُبح صُبح جو میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پورا جوہڑ مُرغابیوں سے پٹا ہے۔ میں جھٹ کونے سے شکاری بندوق اُٹھا اور باہر کو بھاگا۔ اتاؤلا سو باؤلا نکلتے میں میرا سَر دروازے کی چوکھٹ سے اس طرح ٹکرایا کہ آنکھوں

سے چنگاریاں پھوٹ نکلیں۔ خیر سر کو سہلاتا میں میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے مُرغابیوں کا نشانہ لے سکتا تھا۔ اب بندوق جو اُٹھاتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ چقماق کا ٹکڑا ہی غائب ہے۔ دروازے سے جو ٹکّر لگی تھی اس کے صدمے سے یہ بھی باہر جا پڑا۔ اب کیا کِیا جائے۔۔۔؟ یکا یک مُجھے یاد آیا کہ میرا سَر چوکھٹ سے ٹکرایا تھا تو آنکھوں سے چنگاریاں نکلی تھیں۔ میں نے بندُوق کا خانہ کھولا۔ اس میں بارُود اور چھرّے بھرے اور اس کی نال مُرغابیوں کی طرف درست کر کے ایک بازو کا گھونسا اپنا ناک پر رسید کیا۔ اب کیا تھا۔ آنکھوں سے پھر چنگاریاں نکلیں اور بندوق سر ہو گئی۔ خُدا جھوٹ نہ بلوائے۔ اس ایک فیر میں کوئی پچاس جوڑے تیتروں کے۔ سب کو اِکٹھا کیا اور خوب ضیافت اُڑائی۔

اچھّا۔۔۔ اب شکار کا ایک واقعہ اور سُنو۔ یہ واقعہ روس کے ایک جنگل کا ہے۔ ایک روز مُجھے ایک ایسی لومڑی نظر آئی جس کی کھال بہت ملائم اور خوبصورت تھی۔ گولی مارتا داغ دار ہو جاتی۔ سوچتے ہوئے ایک ترکیب سُوجھ گئی۔ اس وقت لومڑی ایک درخت کے پاس بے خبر کھڑی تھی۔ میں نے گولی نکالی اور ایک کیل اس میں پھنسا دی۔ اس کے بعد اس کی دُم کو نشانہ بنایا۔ کِیل نشانے پر پڑی اور لومڑی کی دُم کو درخت کے تنے میں پیوست کر دیا۔



ہر چند زور مارتی تھی، الگ نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے قریب جا کر چاقو سے ایک شگاف اِدھر کر دیا اور دوسرا اُدھر کو، جیسے ضرب کا نشان بناتے ہیں۔ پھر ایسے تڑا تڑا کوڑے جمائے کہ لومڑی کھال کو وہیں چھوڑ نکل بھاگی۔

ایک اور واقعہ اِس سے ملتا جلتا عرض کرتا ہوں۔ میں گھنے جنگل میں شکار کھیل رہا تھا کہ ایک سؤر اور سؤرنی کو آگے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ میں نے گولی داغ دی لیکن اتّفاق دیکھیے کہ کسی کو بھی نہ لگی۔ تاہم میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ سؤر تو بھاگتا دُور نکل گیا ہے اور سؤرنی وہیں جمی کھڑی ہے۔ پاس جا کر دیکھا تو بھید کھُلا۔ سؤرنی بڑھاپے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو گئی تھی۔ اِس لیے اپنے سؤر کی دُم منہ میں لے کر چلتی تھی۔ میری گولی سؤر کی دُم پر پڑی۔ آدھی دُم سؤر لے بھاگا آدھی اِس سؤرنی کے منہ میں رہ گئی۔ اس بے چاری کو حادثے کا پتہ تک نہ چلا۔ میں نے دُم کے اس ٹکڑے کو تھاما اور سؤرنی کو کھینچتا کھینچتا اپنے گھر لے آیا۔

یہ سؤرنیاں بڑی خوفناک ہوتی ہیں لیکن سؤر اُن سے بھی بڑھ کر، خصوصاً وہ جن کے دانت ہاتھی یا گینڈے کی طرح باہر کو نکلے ہوتے ہیں۔ ایک بار ایسے ہی ایک سؤر نے اچانک مُجھ پر حملہ کر دیا اور تو کوئی صورت نہ تھی، پاس ہی ایک درخت تھا۔ میں اس کے پیچھے سٹک گیا۔ سؤر نے حملہ اس زور سے کیا تھا کہ اس کے دانت درخت کے

تنے میں کھب گئے اور آر پار نکل گئے۔ بہت زور مارتا تھا لیکن دانت پیچھے نہ کھینچ سکتا تھا۔ مزید احتیاط کے لیے میں نے ایک پتھّر اُٹھایا اور دانتوں کے سوؤں کو کیلوں کی طرح موڑ دیا۔ اس کے بعد بستی میں گیا۔ رسّے لایا اور ایک گاڑی اور سؤر کو زندہ ہی باندھ کر گاڑی میں ڈال لے گیا۔ بالکل کوئی دِقّت نہ ہوئی۔

ہرن رے ہرن تیرے سر پر بیری

عزیزو۔۔۔ تم نے سُنا ہو گا کہ جنگل میں ایک مقدّس ہرن ہوتا ہے جس کے ماتھے پر صلیب گڑی ہوتی ہے۔ یہ ایک ولی اللہ کے نام سے منسوب ہے اور اس کو گزند نہیں پہنچانا چاہیے۔ آپ پوچھیں گے کہ تم نے بھی اُسے دیکھا ہے؟ میں نے اس صلیب والے ہرن کو تو نہیں دیکھا لیکن جو اپنی آنکھوں دیکھا ہے بیان کرتا ہوں۔

ایک روز کی بات ہے سارا دِن شکار کھیلتے میرے چھرّے اور گولیاں صرف ہو چکی تھیں کہ ایک بارہ سنگھے سے سامنا ہو گیا۔ اب کیا کیا جائے؟ بارُود تو تھا لیکن گولیوں

کی جگہ کیا ڈالا جائے۔ اتّفاق سے میں اس وقت کھڑا بیر کھا رہا تھا اور بہت سی گٹھلیاں آس پاس بکھری پڑی تھیں۔ میں نے وہی گٹھلیاں مٹھی بھر جمع کیں اور بندوق میں ڈال بارہ سنگھے کی پیشانی کا نشانہ لیا۔ نشانہ عین سینگوں کے درمیان لگا اور وہ چوٹ کھا کر بھاگ نکلا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔



اس کے کوئی دو سال بعد کی بات ہے میں ایک بار پھر اسی جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔ ایک بارہ سنگھے کو دیکھا جس کی ٹانگوں کے بیچوں بیچ کئی ہاتھ اونچا بیر کا پیڑ اُگا ہوا تھا۔ تب مُجھے پُرانا واقعہ یاد آ گیا۔ یہ ہرن تو میرا حق تھا۔ میں نے ایک گولی سے اُسے گرا لیا۔ ایک گولی میں دو شکار کیے۔ گوشت اپنی جگہ اور بیر اپنی جگہ۔ سچ یہ ہے کہ یہ بیر اتنے لذیذ تھے کہ پہلے کبھی مُجھے ایسے بیر کھانے کا اتّفاق نہ ہوا تھا۔

گولی بارُود ختم ہونے کا ذکر آیا تو ایک واقعہ اور سُن لیجیے۔ یہ مرحلہ شکاری کے لیے بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ ایک دِن پولینڈ کے ایک جنگل میں دِن بھر شکار کھیلنے میں اپنا سارا ذخیرہ ختم کر بیٹھا تھا کہ ایک خوفناک ریچھ سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہ وحشی جانور منہ پھاڑے میری طرف لپکا۔ میں نے بچے کھچے بارُود کے لیے اپنی جیبوں کو پھر دیکھا لیکن کُچھ بھی نہ تھا سوائے چقماق کے دو ٹکڑوں کے۔ میں نے ان میں سے ایک پتّھر پورے زور سے اس ریچھ کے کھُلے منہ میں دے مارا اور وہ اس کے حلق میں سے ہوتا ہوا شکم کے اندر چلا گیا۔ ریچھ گھبرا کر پچھلے پاؤں بھاگا۔ اب دوسرا چقماق میں نے پیچھے سے دے مارا۔ وہ بھی اس کے جسم میں گھُستا چلا گیا اور آخر پہلے چقماق سے ٹکرایا۔ اس سے آگ پیدا ہوئی اور ریچھ بھک سے اُڑ گیا۔ اس بار تو میں سلامت آ گیا۔ خُدا نہ کرے پھر کبھی ایسی نوبت آئے۔

ایک واقعہ ایک بھیڑیے کا بھی ہے جو ایسے وقت مُجھ پر پل پڑا کہ گولی بارُود کیا چقماق تک سے جیب خالی تھی۔ میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ ہی اُس کے منہ میں ٹھونس دیا اور اسے اندر گھسیڑتا چلا گیا حتّٰی کہ پورا ہاتھ کاندھے تک بھیڑیے کے حلق اور شکم میں سے ہوتا ہوا دم تک پہنچ گیا۔ میں اور ریچھ آمنے سامنے ایک دوسرے کو خون پینے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ اگر میں ہاتھ باہر نکالتا تو وہ فوراً میری تکہ بوٹی کر دیتا۔ اس کی دُم کی جڑ میرے ہاتھ میں آجانا بہت اچھّا ہوا۔ میں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ پورے بھیڑیے کو اس طرح اُلٹا دیا جیسے آپ دستانے کو یا بنیان کو یا موزے کو اُتار پھینکتے ہیں۔ اندر کا حصّہ باہر کی طرف، باہر کا حصّہ اندر۔

ایک بار سینٹ پیٹرزبرگ کی ایک تنگ گلی میں ایک پاگل کُتّا سامنے آنکلا۔ اب کیا ہو؟ میں نے اپنا کوٹ اُتارا اور اس پر پھینک دیا اور خود بھاگ کر گھر چلا گیا جو وہاں سے کُچھ دُور نہ تھا۔ میں نے اپنے نوکر سے کہا کہ فلاں گلی میں میرا کوٹ اُٹھا لاؤ۔ وہ اُسے اُٹھا لایا اور لا کر میری کپڑوں کی الماری میں لٹکا دیا۔ اگلے روز نوکر بھاگا بھاگا میرے پاس آیا کہ حضور آپ کا کوٹ پاگل ہو گیا ہے۔ دوسرے کپڑوں کو کاٹ رہا ہے۔ میں جھپٹ کر پہنچا۔ واقعی میرے سارے کپڑے چیتھڑا ہوئے پڑے تھے۔ نوکر کا کہنا صحیح تھا۔ خود میرے دیکھتے دیکھتے یہ کوٹ میرے ایک نئے سوٹ پر آگرا اور بے دردی سے اُسے نوچ کر دُور پھینک دیا۔

داستان آدھے گھوڑے کی

صاحبو! یہ جو میں اتنی مہموں میں بال بال بچا اس میں بے شک کُچھ دخل قسمت کو بھی ہے لیکن وہ شکاری یا سپاہی، کرنیل یا جرنیل بڑا ہی بے وقوف ہو گا جو قسمت ہی پہ تکیہ کیے بیٹھا رہے اور اپنے فن میں کمال پیدا نہ کرے۔ میں نے شمشیر زنی اور بندوق بازی میں ایسی مہارت پیدا کی کہ کوئی مُجھے زک نہیں دے سکتا اور شکار کے لیے گھوڑے اور کُتّے بھی بہت اعلیٰ سے اعلیٰ اپنے پاس رکھے۔ آج ذکر ایک کُتّیا کا سُنو کہ اصیل شکاری نسل کی تھی جو اپنی تیزی اور طراری میں مشہور ہے۔ میں نے ایسی اچھّی کُتّیا آج تک نہیں دیکھی۔ قد تو اس کا کُچھ خاص نہ تھا، ہاں دوڑنے میں

جواب نہ تھا۔ اس نے تو اتنے دِنوں میری خدمت کی کہ جوان سے بوڑھی ہو گئی۔ پھر بھی مُجھے اتنی عزیز تھی کہ شکار میں ساتھ رکھتا تھا۔ یہ میری رکاب میں اتنا دوڑی، اتنے دِنوں دوڑی کہ اس کی ٹانگیں گھُس گھُس کر چھوٹی چھوٹی رہ گئی تھیں جیسی بعض نمائشی پالتو کُتیّاؤں کی آپ نے دیکھی ہوں گی۔



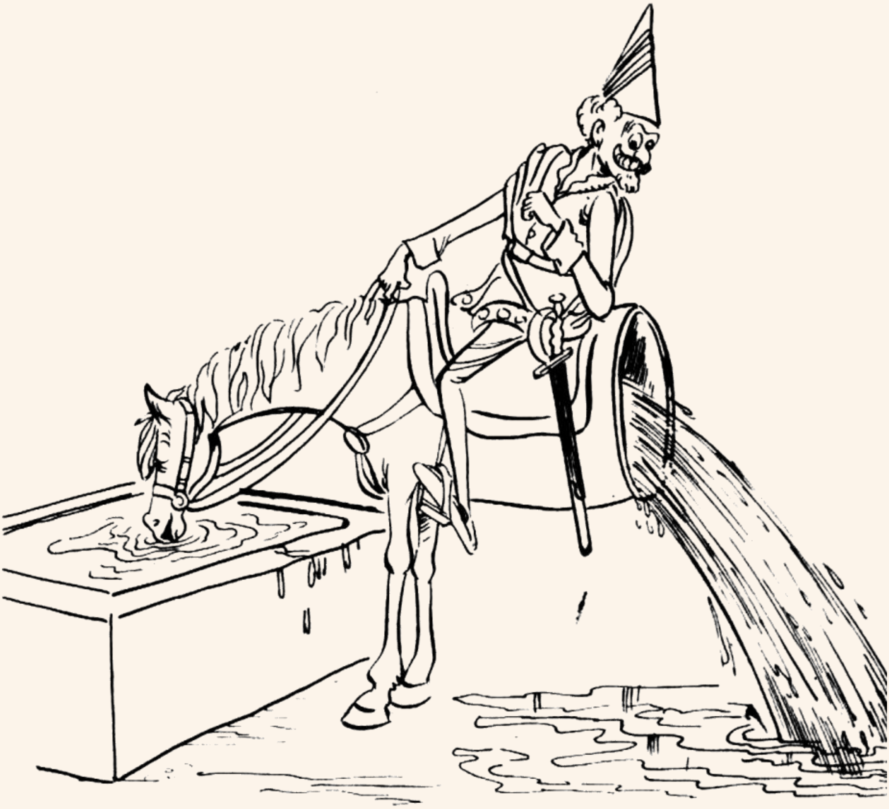


ایک روز ایک خرگوشنی کا تعاقب کرتے ہوئے جو بڑی موٹی تازی تھی۔ مجھے اپنی کُتّیا پر بڑا رحم آیا۔ کیوں کہ یہ کوئی دِن میں بچّے دینے والی تھی۔ اس حالت میں بھی یہ ایسی برق تھی کہ میرا گھوڑا اُس کے گرد کو نہ پہنچتا تھا۔ یکایک چوں چوں، چوں چوں کی بہت سی آوازیں میرے کان میں آئیں جیسے بہت سے کُتّے بول رہے ہوں۔ کُچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا بات ہے۔ گھوڑے کو ڈپٹ کر کُتّیا کے قریب پہنچا تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ خرگوشنی نے بھاگتے بھاگتے میں بچّے دے دیے تھے اور کتیا نے بھی تعاقب کرتے کرتے پلّے جَن دیے تھے۔ جتنے بچّے خرگوشنی نے دیے، اتنے ہی کُتّیا نے۔ خرگوشنی کے بچّوں نے پیدا ہوتے ہی اپنی فطرت کے مطابق دوڑنا شروع کر دیا اور کُتّیا کے بچّوں نے اپنی فطرت کے مطابق اُن کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ جو دوڑ ایک کُتّیا سے شروع ہوئی تھی اُس کے خاتمے تک میں چھ خرگوشوں اور چھ کُتّوں کا مالک بن چکا تھا۔



جیسی یہ کُتّیا تھی ویسا ہی ایک گھوڑا مجُھے یاد آتا ہے۔ یہ بھی اپنی خوبیوں میں بے مثال تھا اور سر اسر انمول۔ یہ حُسنِ اتّفاق سے مجُھے مل گیا۔ ہوا یوں کہ لیتھونیا میں ایک امیر کی دیہاتی جاگیر میں مَیں اُس کا مہمان تھا اور دیوان خانے میں بیٹھا تھا جہاں کُچھ مہمان خواتین بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ باقی لوگ باہر احاطے میں ایک الل بچھیرے کو دیکھ رہے تھے جو ابھی پرورش گاہ سے آیا تھا۔ یکایک باہر ایک ہنگامہ سا ہوا۔ میں بھاگا بھاگا باہر گیا۔ دیکھا کہ وہ منہ زور بچھیرا کسی کے قابو میں نہیں آرہا۔ کسی کو پاس تک پھٹکنے نہیں دیتا۔ بڑے بڑے شہسوار منہ لٹکائے کھڑے تھے۔ میں نے ایک جست کی اور اس کی پیٹھ پر جا سوار ہوا۔ اس نے بہت سر شوری کی لیکن کہاں جا سکتا تھا۔ آخر کنوتیاں ڈال دیں۔ میں نے اسے خوب دوڑایا۔ سب لوگ حیران رہ گئے۔ اب جی میں آیا کہ کُچھ کمالات اس کے ان بیبیوں کو بھی دکھائے جائیں، جو اندرون خانہ بیٹھی تھیں۔ میں نے ایک کھُلی کھڑکی سے اُسے دیوان خانے میں کُدوا دیا۔ اُسے کمرے میں کئی چکّر دیے، کبھی تیز کبھی آہستہ کبھی دُلکی کبھی پویا اور آخر چائے کی میز کے اوپر جا چڑھایا۔ اس منہ زور کی نزاکت رفتار کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ہر چند اس نے میز پر جولانیاں دِکھائیں لیکن کسی پرچ پیالے کو بال برابر گزند نہ پہنچا۔ اس مظاہرے سے وہ فیاض طبع دیہاتی امیر ایسا خوش ہوا کہ وہ گھوڑا مجُھے انعام میں دے دیا۔ اس گھوڑے کی بدولت میں نے بعد ترکی کے مقابلے میں

بڑے بڑے کارنامے دِکھائے۔ اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر میں خود کو سکندرِ اعظم سمجھنے لگتا تھا اور جی میں سکندر ہی کی طرح دُنیا کا فتح کا ولولہ پیدا ہوتا تھا۔



ایک بار اس گھوڑے کی بدولت میری جان جوکھوں میں پڑ گئی تھی۔ ترکوں کا پیچھا کرتے ہوئے میں ہراول میں تھا کہ یکایک کہیں سے ان کا بہت بڑا لشکر نمودار ہوا۔ میں نے اپنے میمنے میسرے یعنی اپنے داہنے اور بائیں دستوں کو دُور دُور تک پھیلا دیا

اور خوب گرد اُڑائی تا کہ وہ سمجھیں ہمارے پاس بہت فوج ہے۔ گھبرا کر اس لشکر نے فرار کی راہ اختیّار کی۔ یہی موقع تھا ان پر پل پڑنے کا اور اُنہیں ہم نے کھدیڑنا شروع کیا۔

آگے اس لشکر کے راستے میں ایک قلعہ بند شہر پڑتا تھا۔ یہ لشکر اس میں گھُس گیا لیکن ہم بھی ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اس لیے یہ اِدھر کے دروازے سے داخل ہوا، پیچھے کے دروازے سے نکل گیا۔ میں اس شہر کے چوک میں پہنچا اور اور دائیں بائیں نظر کی تو اپنا کوئی ساتھی نظر نہ آیا۔ بس میں اکیلا تھا۔ جانے وہ لوگ دُشمن کا پیچھا کرتے کرتے دوسری گلیوں میں نکل گئے یا آسمان ان کو کھا گیا؟ بہرحال میں نے سوچا اتنی دیر میں گھوڑے کو پانی پلا کر تازہ دم کر لوں۔ پاس ہی پانی کا کُنڈ تھا۔ گھوڑا پانی پیتا گیا اور پیتا گیا۔ ایسا لگتا کہ اس کی پیاس کبھی ختم ہی نہ ہو گی۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو صاحبو یقین کرنا۔ اس گھوڑے کا آدھا دھڑ اور پچھلی دونوں ٹانگیں غائب تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے تلوار کے ایک وار سے دو حصّوں میں کاٹ دیا ہو۔ پانی اِدھر سے جاتا تھا اُدھر سے نکل جاتا تھا۔ ظاہر ہے پیاس کیسے بجھتی۔ لیکن یہ ہوا کیسے؟ کُچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ حتّٰی کہ میں لوٹ کر شہر کے دروازے پر پہنچا جہاں سے داخل ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ جس وقت میں دُشمن کا سرپٹ تعاقب کرتے ہوئے دروازے پر پہنچا تو آدھا اندر تھا آدھا باہر کے محافظوں

نے تیز دندانوں والا آہنی پھاٹک نیچے گرا دیا۔ اُس نے اِس صفائی سے گھوڑے کا پچھلا دھڑ کاٹ دیا کہ مجُھے پتہ بھی نہ چلا۔ یہ دَھڑ اب بھی سلاخوں کے اُس پار اٹکا ہوا تھا۔



میں نے پھاٹک اُٹھوایا اور ایک موچی سے کہا کہ لو پچھلے دَھڑ کو اگلے دَھڑ کے ساتھ سِی دو۔ وہ باکمال آدمی تھا۔ دھاگا اُس کے پاس اتنا نہیں تھا وہاں قریب ہی کُچھ بیلیں اُگی ہوئی تھیں۔ اُنھی کے ریشے لے کر سلائی کر دی۔ کوئی دِن میں زخم بھر گیا اور اس کے ساتھ ہی یہ کمال ہوا کہ بیلوں کے ریشوں نے جسم میں جڑیں پکڑ لیں اور

بیلیں بڑھتے بڑھتے اُوپر ایک سایہ دار چھتر بن دیا۔ بعد میں کئی مہموں میں مَیں نے انھی کے سائے میں دھوپ سے محفوظ بہادری کے جوہر دِکھائے۔



ماجرا چاند پر چڑھنے اُترنے کا

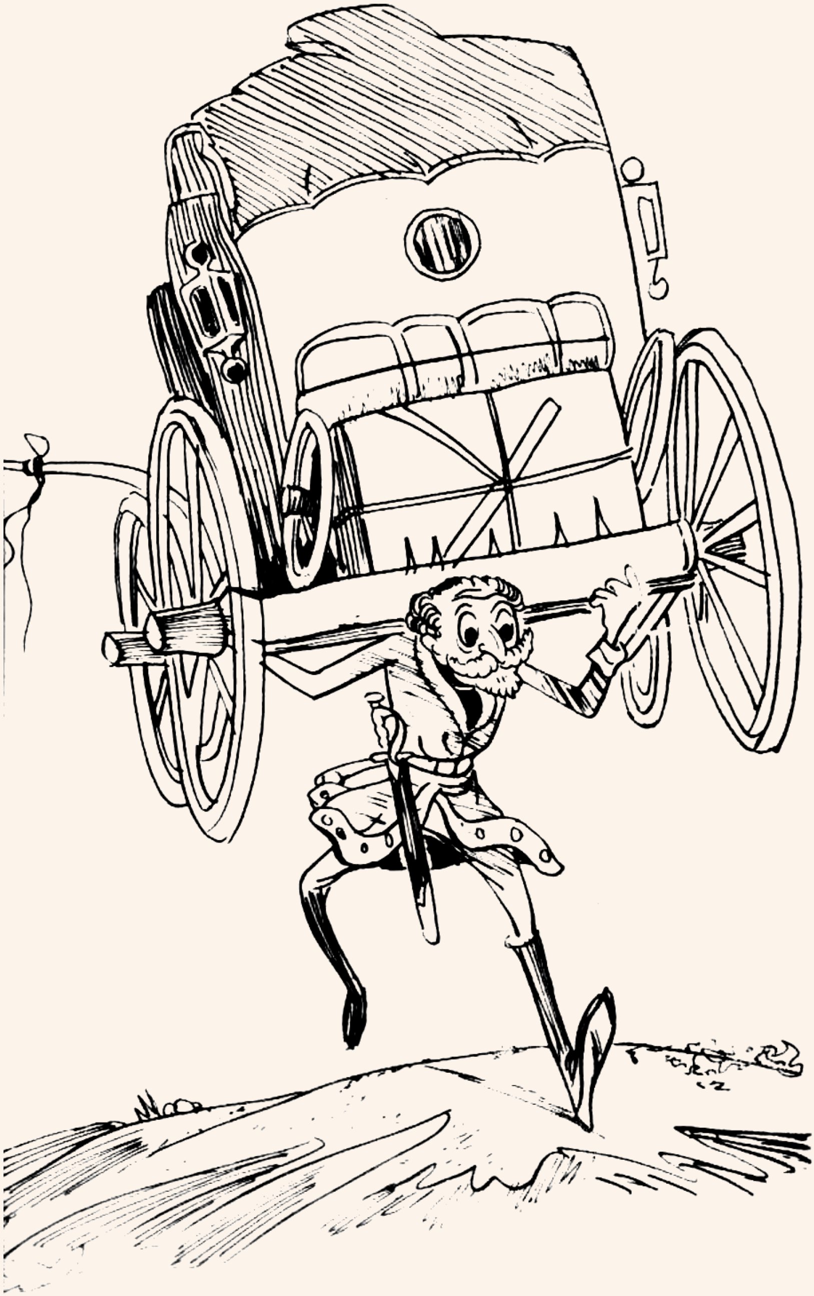
صاحبو! تُم جانتے ہو کہ جنگ میں فتح و شکست نصیبوں سے ہوتی ہے۔ کبھی آدمی جیتتا ہے کبھی ہارتا ہے۔ ایک بار غنیم کی تعداد اتنی تھی کہ ہم تاب نہ لا سکے۔ میں بھی گرفتار ہوا اور ترکوں نے مُجھے غلام بنالیا۔ کام میرا سخت تو نہ تھا لیکن کُچھ عجب طرح کا تھا یعنی سلطان کے چھتّے کی مکھّیوں کو ہر صُبح چرانے کے لیے سبزہ زار میں لے جانا۔ سارا دِن ان کی دیکھ بھال کرنا اور شام کو ہانکتے ہوئے واپس چھتّوں میں لانا۔ ایک شام میں نے دیکھا کہ ایک مکھّی کم ہے۔ تلاش پر دیکھا کہ دو ریچھوں کے نرغے میں ہے اور وہ اُس کو چیر پھاڑ کر اُس کے جسم کا شہد چٹ کر جانے کی فکر میں ہیں۔ اتّفاق

سے اُس وقت میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا سوائے چاندی کی اُس چھوٹی سی نمائشی کلہاڑی کے جو سلطان کے مالیوں اور باغبانوں کا نشان ہے۔ میں نے وہی کلہاڑی گھُما کر اُن موذیوں پر دے ماری لیکن وہ بجائے اُن کی طرف رُخ کرنے کے اُوپر چلی گئی۔ میں نے اُسے اتنے زور سے پھینکا تھا کہ اُوپر چڑھتی چڑھتی چاند پر جا گری۔ اب اُسے کیسے اُتارا جائے۔ یکایک ایک ترکیب سُوجھ گئی۔ ترکی لوبیے کی بیل پر بہت تیزی سے بڑھتی ہے۔ میں نے جھَٹ ایک بیج بویا اور وہ پھوٹ نکلا اور دیکھتے دیکھتے بڑھتے بڑھتے آسمان کی خبر لانے لگا۔ حتّیٰ کہ اُس کا سر چاند کی ایک نوک سے لپٹ گیا۔ اب کیا تھا۔ میں کمند کی طرح اُس پر چڑھتا جھٹ چاند پر پہنچ گیا۔ چاند پر ہر چیز چاندی کی ہوتی ہے اس لیے اس چھوٹی سی نقرئی کلہاڑی کو تلاش کرنے میں تھوڑی دقّت ضرور ہوئی لیکن آخر وہ پیال اور بھُوسے کے ایک ڈھیر میں پڑی مل گئی۔ اب سوال نیچے اُترنے کا تھا۔ افسوس کہ اتنی دیر میں سُورج نے لوبیے کی بیل کو اِس طرح جھُلس دیا تھا کہ اس کے سہارے اُترنا مُمکن نہ تھا۔ میں نے اس پیال کا رسّا جتنا بھی لمبا بٹ سکتا تھا بٹا اور اُسے چاند کی ایک نوک سے باندھ کر اُس کے سہارے پھسلنا شروع کر دیا۔ رسّا ختم ہو گیا لیکن زمین ابھی بہت دُور تھی۔ میں نے سوچا اب یہاں تک آ گیا ہوں اُوپر کے رسّے کی اب ضرورت نہیں۔ لہٰذا کلہاڑی سے اُسے کاٹا اور نیچے کی طرف جوڑ دیا۔ صاحبو! یونہی اُوپر کا رسّا کاٹ کر نیچے جوڑتا، گرہ لگاتا میں نیچے



اُتر تا گیا۔ لیکن بار بار کاٹنے جوڑنے سے رسّا کمزور ہو گیا تھا۔ میں زمین سے چار پانچ میل کی بُلندی پر ہوں گا کہ یہ رسّا ٹوٹ گیا اور میں اتنے زور سے زمین پر آکر گِرا کہ بالکل بھنّا گیا۔ بلکہ اٹھارہ بیس گز زمیں کے اندر دَھنس گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ یہاں سے باہر کیسے نکلا جائے۔ آخر میں پاس کے گاؤں گیا، پھاوڑا لایا اور اپنے کو کھود نکالا۔

ترکوں سے صلح نامہ ہوا تو میں بھی آزاد کر دیا گیا اور سینٹ پیٹرز برگ روانہ ہو گیا۔ یہ واقعہ بھی جاڑوں کا ہے اور اُدھر کے جاڑے آپ جانتے ہیں۔ میں ڈاک کی گھوڑا گاڑی میں بیٹھا سفر کر رہا تھا کہ ایک شہر میں ایک تنگ گلی سے گزر ہوا۔ میں نے کوچ بان سے کہا کہ ترم بجاؤ تا کہ اُدھر سے کوئی گاڑی ہمارے باہر نکلنے تک گلی میں داخل نہ ہو۔ اس نے بڑے زور سے ترم میں پھونکا لیکن صدا برنخاست۔ اتنے میں سامنے سے بھی ایک کوچ گاڑی آتی دکھائی دی۔ اب کیا ہو؟ نہ آگے بڑھ سکتے تھے نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے۔ آخر میں خُدا کا نام لے کر اُترا اور ایک ہاتھ سے گاڑی کو اُٹھا پہیّوں وہیوں سمیت اپنے سر پر رکھ لیا اور گلی سے باہر ایک طرف کو کھیتوں میں کُود گیا۔ اس کے بعد دوبارہ چھلانگ لگا کر اس دوسری کوچ گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی کو جا اُتارا۔ اب گھوڑے رہ گئے تھے۔ ایک کو اُٹھا کر میں نے اپنے سر پر رکھا اور دوسرے کو بغل میں دابا۔ اس نٹ کھٹ نے دولتیاں تو بہت جھاڑیں لیکن میں نے اس کی



پچھلی ٹانگوں کو اپنی جیب میں اُڑس لیا تھا۔ آخر دونوں کو پھر گاڑی میں جوت ہم آگے روانہ ہوئے اور تھوڑی دیر بعد بستی کی سرائے میں جا اُترے۔

سرائے میں پہنچ کر ہم نے آرام کا ارادہ کیا۔ کوچ بان نے اپنی ترم کو چولہے کے پاس ایک کھونٹی پر لٹکا دیا اور میں دوسری طرف ٹانگیں پِسار کر بیٹھ گیا۔ یکا یک ایک آواز سُنائی دی۔ توں توں۔ توں توں۔ ہم نے حیران ہو کر پھر کر دیکھا۔ یہ آواز تُرم میں سے آرہی تھی۔ اب بات ہماری سمجھ میں آئی۔ کوچ بان کی پھونکیں سردی کے مارے ترم کے اندر جم گئی تھیں۔ اب گرمی جو پہنچی تو آواز نکلی۔ اس کے بعد بھی طرح طرح کی راگنیاں بر آمد ہوئیں جو کوچ بان نے اس میں پھونک رکھی تھیں۔ ہم بہت دیر تک ان سے محظوظ ہوتے رہے۔

(صاحبو! اس کارنامے کے ساتھ میں روس کی سیاحت کا ذکر ختم کرتا ہوں۔ بعض سیاح اپنی داستان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان پر خُدا کی مار۔ اگر تم میں سے کسی کو میرے بیان کی صداقت پر ذرا بھی شبہ ہو تو میں درخواست کروں گا کہ اس محفل سے اُٹھ جائے تا کہ میں اپنے کارناموں کی دوسری کھیپ کا آغاز کروں۔ جس کا ایک ایک حرف اسی طرح سچ ہے جس طرح اب تک کے بیان کردہ واقعات)

کھلنا توپ کے گولوں سے

عزیزو۔۔۔اب میں ایک واقعہ جبرالٹر کے محاصرے کا بیان کرتا ہوں جہاں ایک طرف انگریز فوجیں پرے باندھے تھیں اور دوسری طرف ہسپانوی لشکر صف آرا تھا۔ میں رسد کے ایک جہاز کے ساتھ لارڈ روڈنی کی کمان میں اپنے پرانے دوست جنرل ایلیٹ سے ملنے گیا تھا۔ جس نے اس حصار کی حفاظت میں بے مثل بہادری کے جوہر دکھاکر شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کی۔ ملنے ملانے کے بعد میں نے مورچے دیکھے اور دُشمن کی پوزیشن کا جائزہ لینے کے لیے نکل گیا۔ جنرل ایلیٹ میرے ساتھ تھے۔ حُسنِ اتّفاق سے لندن سے میں ایک بہت عمدہ دُوربین خرید کر

چلا تھا۔ اسے آنکھوں سے جو لگا کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دُشمن کا توپ خانہ اٹھارہ سیری گولہ عین اُسی جگہ پر پھینکنے کی تیّاری کر رہا ہے جہاں ہم کھڑے تھے۔ میں نے جرنیل صاحب کو بتایا، اُنہوں نے بھی دُوربین سے دیکھ کر تصدیق کی۔ میں نے فوراً جرنیل صاحب کی اجازت سے ایک چوبیس سیری گولہ پھینکنے والی توپ منگائی اور اپنی توپ کی دیرینہ مہارت سے کام لیتے ہوئے اُسے ایسی جگہ پر نصب کیا جہاں سے دُشمن کا توپ خانہ سیدھا زد میں آتا تھا۔

میں نے دُشمن کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی حتّٰی کہ میں نے دیکھا کہ دُشمن نے توپ سر کرنے کے لیے فلیتہ لگا دیا ہے۔ عین اسی لمحے میں نے اپنی توپ سر کرنے کا حکم دیا۔

دونوں گولے رستے ہی میں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور آپ اندازہ کر سکتے ہیں کتنے زور سے ٹکرائے ہوں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دُشمن کا گولہ جدھر سے آیا تھا ادھر کو زور سے پلٹا کہ سب سے پہلے تو توپچی کا سر اُڑا کر لے گیا، اس کے بعد سولہ اور آدمیوں کا صفایا کیا جو اس کے راستے میں پڑے۔ قریب ساحل پر تین جہاز ایک دوسرے پیچھے لنگر انداز تھے۔ گولہ اُن کے مستولوں کو چیرتا ہوا ساحل پر پہنچا تو اس کا زور صرف ہو چکا تھا۔ بس اتنا رہ گیا تھا کہ دو سو گز دُور ایک غریب مزدور کے

جھونپڑے کی چھت چیر کر اندر جا گرا۔ وہاں ایک بڑھیا منہ کھولے خرّاٹے لیتی سو رہی تھی۔ یہ گولہ اس کے رہے سہے دانتوں کا صفایا بولتا ہوا اس کے حلق میں جا پھنسا۔ تھوڑی دیر بعد اس عورت کا میاں گھر آیا اور اس نے بہت کوشش کی کہ گولہ نکل آئے لیکن نہ نکلا۔ آخر ہتھوڑا لے کر اس کے حلق سے اس بڑھیا کے پیٹ میں اُتار دیا۔



اس ایک گولے نے لڑائی کا پانسہ پلٹ دیا۔ اس کی ضرب سے وہ توپ بھی جس نے اسے سر کیا تھا اپنی جگہ سے اُکھڑ کر دھماکے کے ساتھ دُشمن کی جنگی جہاز کے عرشے پر جا گری اور اسے توڑتی ہوئی جہاز کے پیندے میں سے بھی گزر گئی اور جہاز دیکھتے دیکھتے پانی بھر کر ڈوب گیا۔ اُس وقت اس جہاز پر دُشمن کے کوئی ایک ہزار جہازی ہوں گے، علاوہ دوسرے سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد کے۔ یہ ایک بڑا کارنامہ تھا لیکن اس کا سہرا فقط میرے سر نہ سمجھا جائے۔ بے شک دریافت اور ترکیب میری ہی تھی لیکن کُچھ دخل حُسنِ اتّفاق کا بھی جانیے۔ مجُھے بعد میں معلوم ہوا کہ ہمارے جس توپچی نے چوبیس سیری گولہ سر کیا، اس نے غَلَطی سے بارُود کی دوگنی مقدار بھر دی تھی۔ یہ نہ ہوتا تو اتنی حیرت انگیز کامیابی نہ ہوتی۔ خصوصاً ہم دُشمن کے گولے کو بیچ رہ سے نہ پلٹا سکتے۔ اس پر جرنیل ایلیٹ نے مجُھے منصب و اعزاز دینے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے کہا جرنیل صاحب یہ تو معمولی بات تھی اور یہ تو میرا فرض تھا۔

یہ سوچ کر کہ ان لوگوں کی کُچھ اور مدد کرنی چاہیے۔ میں کُچھ دِن کے لیے وہاں رُک گیا۔ ایک روز پادری کا بھیس بنا کر آدھی رات کو دُشمن کے سنتریوں کو جُل دے کر ان کے کمپُو میں جا گھُسا اور وہاں پرنس وار توئے کے خیمے میں پہنچ گیا۔ اس وقت پرنس موصوف اپنے سپہ سالار اور دوسرے اعلیٰ فوجی افسروں کے ساتھ مسکوٹ کر

رہے تھے کہ صُبح دَم انگریزی مورچوں پر دھاوا بول دیا جائے۔ میرے بھیس کی وجہ سے وہ میری طرف سے نچنت ہو کر باتیں کرتے رہے۔ میں چُپکا سُنتا رہا، حتّٰی کہ وہ لوگ سو گئے۔ جب میں نے دیکھا کہ لشکری سوئے ہوئے ہیں اور سنتری بھی خواب غفلت میں ہیں تو میں نے اپنا کام شروع کیا۔ اس وقت دُشمن نے حملے کی تیّاری میں کوئی تین سو توپیں نصب کر رکھی تھیں، کُچھ چھوٹی کُچھ بڑی۔ میں نے ایک ایک کو اُکھاڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔ وہ ساحل سے کوئی تین چار میل دُور جا کر گریں۔ میرے ساتھ کوئی اور مدد گار نہ تھا لہٰذا اس کام میں مشقّت تو خاصی ہوئی۔ بعد ازاں میں نے دُشمن کی تمام فوجی گاڑیوں کو اُٹھا کر کیمپ کے وسط میں ڈھیر کر دیا۔ میں نے اس خیال سے کہ دھکیلنے سے پہیّے آواز پیدا کریں گے اور لوگ اُٹھ جائیں گے۔ ان کو دو دو کر کے اُٹھایا، ایک کو اس بغل میں دوسرے کو دوسری بغل میں۔ ان کا ڈھیر بجائے خود جبر الٹر کی پہاڑی کے برابر اُونچا ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے مسلمانوں کے عہد کی ایک پرانی دیوار کے پتھّر سے پتھّر ٹکرا کر فلیتہ جلایا اور اس ڈھیر کو آگ لگا دی۔ میں یہ بتانا بھُول گیا کہ میں نے بارُود کی گاڑیوں کو بھی اُٹھا کر اس ڈھیر کی چوٹی پر دَھر دیا تھا۔ قصّہ مختصر میں نے فلیتہ دِکھایا اور الاؤ بھڑک اُٹھا۔ اس خیال سے کہ مُجھ پر شبہ نہ کیا جائے سب سے زیادہ واویلا میں نے خود مچایا۔ سب حیران کہ یہ کیا ماجرا ہو گیا اور شُبہ ان کا سنتریوں کی طرف گیا۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کے توپ

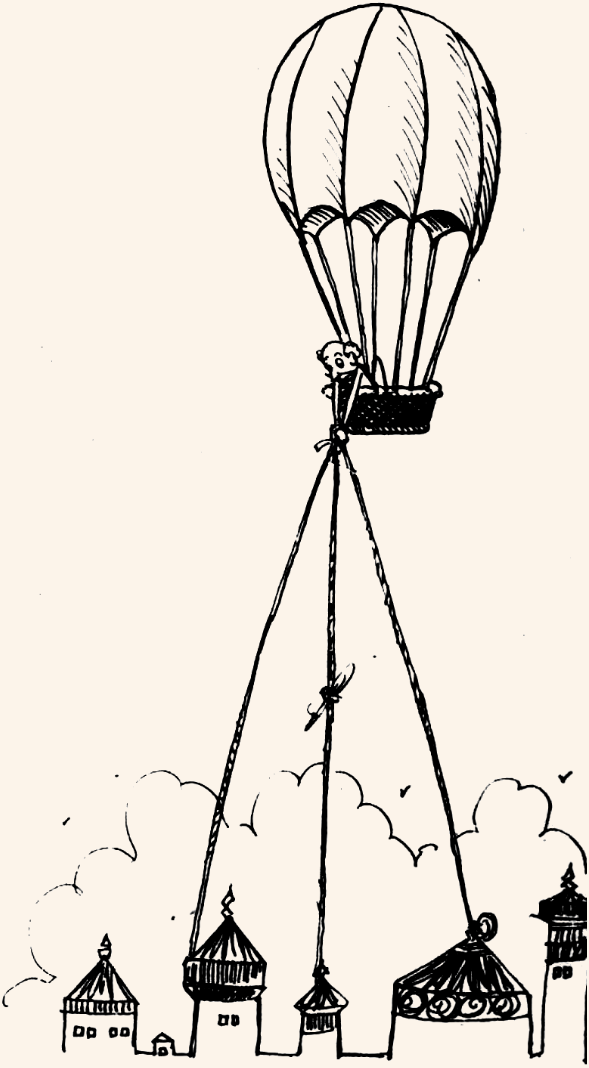
خانے کی تہس نہس کرنے میں انگریزی لشکر کی ساتھ آٹھ رجمنٹوں نے حصّہ لیا ہو گا۔ وقائع نگاروں نے اس لڑائی کے احوال میں اس واقعہ کا ذکر ضرور کیا ہے لیکن اصل وجہ نہیں لکھی۔ لکھتے تو جب اگر میں نے کسی سے ذکر کیا ہوتا۔ اگرچہ جبر الٹر میں انگریزوں کی نصرت کا باعث میری واحد ذات تھی لیکن اس کارنامے کا تذکرہ جنرل ایلیٹ تک سے کرنا میں نے غیر ضروری خیال کیا۔ کاؤنٹ وارتوئے اور اس کا لشکر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تو پیرس پہنچ کر دَم لیا۔ اس حادثے نے ان کے حواس پر ایسا اثر کیا کہ کئی ہفتے ان کو کھانے پینے تک کی ہوش نہ رہی۔ خالی ہوا پر گزران کرتے رہے۔

اگر کوئی صاحب میری سرگزشت کو جھوٹ یا مبالغہ سمجھنے کی جسارت کریں گے تو پورے ایک گیلن برانڈی کے جرمانے کے مستوجب ہوں گے اور یہ گیلن بھر برانڈی ان کو ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اُتارنی پڑے گی۔ فوجوں کی اس مدد کے واقعہ کے کوئی دو ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک روز جنرل ایلیٹ کے ساتھ بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ ایک گولہ چھت پھاڑ کر آیا اور عین ہماری میز پر آکر گرا۔ جرنیل صاحب تو خطرے کے پیشِ نظر کمرے سے فی الفور بھاگے لیکن میں نے اس گولے کو جو ابھی پھٹا نہیں تھا، ہاتھوں میں اُٹھا لیا اور پہاڑی پر چڑھا۔۔۔ دُشمنوں کی صفوں کی طرف دیکھا تو وہاں ایک جمگھٹا سا نظر آیا۔ دُوربین کام آئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں

نے ہمارے دو افسروں کو جن میں ایک جرنیل تھا اور وہ جرنیل رات کو ان کے کیمپ کی جاسوسی کرنے کے لیے گئے تھے، جکڑ رکھا ہے اور ان کو سولی پر چڑھانے کا سامان ہو رہا ہے۔ فاصلہ کُچھ زیادہ تھا۔ ہاتھ سے گولہ پھینکتا تو نہ پہنچتا۔ لہٰذا میں نے اپنا گوپھیا نکالا اور گولہ اس میں غلّے کی طرح رکھ کر دُشمن کی ٹکڑی پر پھینک دیا۔ یہ گرتے گرتے پھٹا اور سب کا صفایا کر دیا، سوائے ان دونوں افسروں کے جو ٹکٹکی پر جکڑے ہوئے تھے۔ گولے کے ایک ٹکڑے نے ٹکٹکی کو بھی جڑوں سے اُکھاڑ دیا اور وہ دونوں افسر زمین پر آ رہے۔ ان لوگوں کو پاؤں میں دھرتی محسوس ہوئی اور اُنہوں نے دُشمن کے کشتوں کے پُشتے لگے دیکھے تو جان میں جان آئی۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کو رسّیاں کھول کر آزاد کیا اور بھاگ کر ساحل پر پہنچے۔ وہاں ایک کشتی کھڑی تھی جس میں دو ہسپانوی ملّاح تھے۔ اس پر قبضہ کر کے وہ ہمارے جہاز پر اُترے۔ اتّفاق سے اس وقت میں جنرل ایلیٹ کو اس واقعی کی روداد سُنا رہا تھا۔ یہ لوگ آ کر میرے گلے سے لپٹ گئے اور وہ دِن ہم نے موج میلے اور راگ رنگ میں گزارا۔

چل میرے غبارے

ایک بار میں نے ایک اتنا بڑا غبارہ بنایا کہ آپ یقین نہ کریں گے۔ لندن اور گرد و نواح کے شہروں میں جتنا ریشمی کپڑا ابھی موجود تھا وہ سارا لے کر میں نے اس کے بنانے میں خرچ کر دیا۔ اس غبارے اور اس کے پہیّے کی مدد سے جس کا میں نے اُوپر ذکر کیا ہے میں نے بڑے کارنامے کیے۔ کسی مکان کو اس کی جگہ سے اُٹھانا اور اس کی جگہ دوسرا مکان رکھ دینا اور اتنی خاموشی اور آہستگی سے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لوگ اگر سوئے ہوتے تھے تو سوئے رہتے تھے ورنہ جاگتے میں بھی ان کو احساس نہ ہونے پاتا تھا کہ ان کا مکان اُٹھایا جا رہا ہے۔



جب ونڈسر کیسل کے سنتری نے سینٹ پال گرجا کے گھڑیال کو بالکل پاس تیرہ
بجاتے سُناتو حیران رہ گیا کیوں کہ سینٹ پال وہاں سے اتنی دُور ہے کہ آواز آنے کا

سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہوا یہ کہ میں نے پورے قلعے کو اُٹھا کر سینٹ پال گرجا کے ساتھ والے میدان میں رکھ دیا تھا اور صُبح ہونے سے پہلے پھر اُٹھالیا۔ قلعے کے اندر لوگ سوئے کے سوئے رہ گئے۔ کسی کو خبر نہ ہوئی۔

لندن کے ڈاکٹری کے کالج میں سال کے سال عہدے داروں کا انتخاب کے لیے ایک جلسہ اور دعوت ہوتی ہے۔ گزشتہ بار میں اپنے غبارے کو پھُلا کر اس کالج کے اُوپر لے گیا اور گنبد میں کمند پھنسا کر اُسے اُٹھالیا۔ اس کالج کو مع دعوت کے مہمانوں اور میزبانوں کے میں آسمان میں اُونچا لے گیا اور کوئی تین ماہ تک وہاں معلّق رکھا۔ آپ پوچھیں گے اس دوران میں ان لوگوں کے کھانے پینے کا کیا ہوا؟ یہ لوگ دعوتوں میں ایسی فضول خرچی برتتے ہیں اور کھانے کے ڈھیر لگاتے ہیں کہ میں اس سے دُگنا وقت بھی ان کو آسمان میں لٹکائے رکھتا تو یہ کھانا ان کے لیے کافی پڑتا۔ میں نے یہ حرکت مذاق میں کی تھی لیکن اس سے بعض معزّزین کا بڑا نقصان ہو گیا مثلاً گورکنوں کا، تابوت بنانے والوں کا اور پادریوں کا۔ کیوں کہ جتنے دِن یہ ڈاکٹر لوگ اُوپر آسمان میں معلّق رہے دُنیا میں بہت کم موتیں ہوئیں وہ بھرمار نہ رہی جو ان لوگوں کی کوششوں سے ہوتی ہے۔ خُدا نے سب کے رزق کا کوئی نہ کوئی وسیلہ بنا رکھا ہے۔ اگر ڈاکٹر لوگ نہ ہوں تو گورکن بھُوکے مریں۔

توپ اُٹھا کے سمندر میں پھینک دی

حضرات۔۔۔ بعض لوگ بڑے بڑ بولے ہوتے ہیں۔ مُجھے ایسے لوگوں سے بڑی چِڑ ہے۔ ایک فرانسیسی نوّاب بیرن ڈی ٹاٹ نے ایک کتاب میں اپنا ایک معرکہ بیان کیا ہے۔

”ترکوں نے قلعے کے نیچے اور دریائے سیموس کے کنارے شہر کے قریب پیتل کی ایک بہت بھاری بھرکم توپ نصب کر رکھی تھی جو پتھّر کا پانچ ساڑھے پانچ سو سیر کا گولہ پھینکتی تھی۔ کسی کو اِس توپ کے چلانے کا حوصلہ نہ تھا۔ جب میں نے اِرادہ

ظاہر کیا تو سبھی تھر تھر کانپنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس توپ کے چلنے سے نہ صرف قلعہ بیٹھ جائے گا بلکہ شہر بھی تہس نہس ہو جائے گا۔ میں نے بڑی مشکل سے دِلاسا دیا تو مُجھے یہ توپ سر کرنے کی اجازت ملی۔ اس میں گولہ چلانے کے لیے سوا چار من بارُود ڈالنا پڑتا تھا اور گولے کا وزن تو میں بتا ہی چکا ہوں، ساڑھ پانچ سو سیر یعنی چودہ من کے لگ بھگ۔ جب یہ چلنے لگا تو سبھی لوگ پیچھے بھاگ گئے۔ حتّٰی کہ پاشا کو بھی میں نے بڑی مشکل سے ٹھہرنے پر راضی کیا اور یقین دِلایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ فلیتہ جلانے والا آدمی بھی گھبرا رہا تھا۔ میں توپ کے پیچھے پتھّروں کے ایک پشتے پر کھڑا ہو گیا اور توپ سر کرنے کا اشارہ دیا، یوں معلوم ہوا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ گولہ کئی میل دُور جا کر پھٹا اور اُس کے تین ٹکڑے ہو گئے۔ یہ ٹکڑے خلیج پار کر کے دوسرے کنارے کی پہاڑی پر جا کر گِرے۔ سارے سمندر کا پانی جھاگ بن گیا۔“

حضرات یہ تو تھی بیرن ڈی ٹاٹ کی کہانی اُس کی اپنی زبانی، اب اس فقیر کی حقیر سرگزشت بھی سُنیے۔ جن دِنوں میں تُرکی گیا سب کی زبان پر اُس کارنامے کا بیان تھا۔ مُجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ ایک فرانسیسی کی تعریف میں لوگ دیوانے ہوں۔ چناں چہ ایک روز میں نے اُس بھاری دیو پیکر توپ کو جس پر لوگوں کو اِتنا ناز تھا اُکھاڑا اور اپنے کاندھے پر رکھ کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اِس بوجھ سمیت تیرتا تیرتا میں

دوسرے کنارے جا نِکلا اور وہیں سے توپ کو گھُما کر پھینکا تا کہ اپنی پہلی جگہ پر جا گرے۔ بد قسمتی سے ایسا کرنے میں میرا ہاتھ تھوڑا رپٹ گیا اور توپ بجائے اُس پار جانے کے عین سمندر کے دھارے میں گر گئی۔ جہاں وہ اب بھی موجود ہے اور اُس کے نکالے جانے کی کوئی صورت نہیں۔ ہر چند کہ سلطان مُجھ پر بڑا مہربان تھا لیکن تھا تو تُرک۔ اِس ظالم کو اپنی توپ کے ضائع ہونے کا علم ہوا تو طیش میں آیا اور میرا سر کاٹ کرلانے کا حکم دیا۔ اتّفاق سے مُجھے ایک سلطانہ نے جو میرے حال پر مہربان تھی اُس کی خبر کر دی بلکہ اُس نے مُجھ کو اپنے پلنگ کے نیچے چھُپا لیا۔ سلطان کے سپاہی اور داروغے مُجھے تلاش کرتے ہی رہ گئے۔

حضرات ویسے تو من آنم کہ من دانم لیکن آپ ہی بتایئے اِس فرانسیسی نوّاب زادے کا کارنامہ زیادہ بڑا تھا یا میرا۔

میں نے قیدی کیسے چھُڑائے

اب سُنیے کہ میں نے کیسے انگریزی قیدیوں کو فرانسیسیوں کی قید اور ظلم کے پنجے سے نکالا۔

جبر الٹر سے انگلستان واپسی کا سفر میں نے فرانس کے راستے کیا۔ میں چوں کہ غیر مُلکی تھا لہٰذا مُجھے کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ انگلستان اور فرانس کے درمیان رودبارِ انگلستان ہے جس کے فرانس والے کنارے پر کیلے کی بندر گاہ ہے اور انگلستان والے کنارے پر ڈوور ہے۔ فرانسیسی بندر گاہ پر میں نے ایک جہاز دیکھا جس میں انگریز

جہازی قید تھے۔ میں نے فوراً ٹھان لی کہ اِن غریبوں کو چھڑُانا چاہیے۔ میں نے دو بہت بڑے بڑے پَر بنائے۔ ہر ایک کوئی بیس گز لمبا اور چودہ گز چوڑا اور اُن کو اپنے بازوؤں سے باندھ کر جہاز کے اُوپر اُڑنے لگا۔ یہ صُبح کا وقت تھا اور سبھی لوگ حتّیٰ کہ سنتری اور پہرے دار بھی خوابِ غفلت میں مَست تھے۔ میں نے اپنے گوپھیا کی مدد سے تین کمندیں جہاز کے مستولوں میں اٹکا دیں اور جہاز کوئی گز پانی سے اُونچا اُٹھالیا اور اِسی عالم میں اُسے ڈوور لے گیا، وہاں میں کوئی آدھ گھنٹے میں پہنچ گیا۔ اب چوں کہ مُجھے پروں کی ضرورت نہ رہی تھی وہ بھی میں نے ڈوور کے قلعہ کے گورنر کی نذر کر دیے۔

انگریز قیدیوں اور فرانسیسی پہرہ داروں کی آنکھ کوئی دو گھنٹے بعد کھُلی۔ انگریزوں کی سمجھ میں معاملہ آیا تو اُنہوں نے فوراً سنتریوں کو قابو میں کیا اور اپنا مال اسباب اُن سے چھینا۔ لیکن اِس سے زیادہ نہیں۔ کیوں کہ انگریز لوگ بہادر اور فیاض ہوتے ہیں اور اپنے حق سے زیادہ لینے کو لُوٹ کھسوٹ سمجھتے ہیں۔

سو جانا توپ کی نال میں

انگلستان میں میرا پہلی بار جانا اتّفاقیہ ہوا۔ یہ موجودہ بادشاہ کے راج کے ابتدائی دِنوں کی بات ہے۔ میں کُچھ سامان جہاز کے راستے ہیمبرک بھیجنے کے لیے قریبی بندرگاہ پر گیا تھا۔ وہاں سے واپسی میں دھوپ بہت تیز تھی۔ ایک تو دِن بھر کے کام کی تھکن، دوسرے دھوپ، سرِ راہ مُجھے ایک توپ پڑی نظر آئی اور میں اُس کی نال میں گھُس کر لیٹ گیا۔ماندگی کی وجہ سے ایسی نیند آئی کہ کسی بات کی ہوش نہ رہی۔ یہ دوپہر کی بات ہے۔ اتنے میں ایک بج گیا اور وقت کا اعلان کرنے کے لیے توپ داغ دی گئی جس میں پہلے سے بارُود وغیرہ بھر رکھا تھا۔ اِن لوگوں کو کیا خبر کہ ایک آدمی توپ

کی نال میں لیٹا سویا ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں جو گولے کی طرح نکلا تو رود بار کے دوسری پار ایک زمیندار کے کھلیان میں جا گرا۔ بھوسے کی وجہ سے کُچھ چوٹ نہ آئی بلکہ آنکھ بھی نہ کھُلی۔ کوئی تین مہینے ایسے ہی گزر گئے حتّٰی کہ بھُوسے کے دام چڑھ گئے اور کسان نے اُسے بیچنے کے لیے منڈی بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ جس ڈھیر پر میں جا کر گِرا تھا وہ سب سے بڑا تھا۔ کوئی پانچ سو پُولے اس میں ہوں گے۔ زمیندار کے کارندے جو پولے اُتارنے کے لیے سیڑھی لگا کر چڑھے تو میری آنکھ کھُل گئی۔ میں اُس زمیندار کے سر پر آن کر گِرا جس سے اُس کی گردن ٹوٹ گئی، لیکن مجُھے کوئی آنچ نہ آئی۔ بعد میں مجُھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ زمیندار بڑا نابکار تھا۔ ہمیشہ مال مہنگا کر کے بیچتا تھا۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

پاتال کی سیر

صاحبو ایک روز سِسلی کا ایک سفر نامہ پڑھتے پڑھتے جی میں شوق چُرایا کہ اس مشہور آتش فشانی پہاڑ ماؤنٹ ایٹنا کو بھی دیکھنا چاہیے۔ اِدھر جی میں بات آئی اُدھر میں رختِ سفر باندھ روانہ ہو گیا۔ میں نے اِس پہاڑ کے دامن میں ایک کاٹیج میں بسیرا کیا اور کوئی تین چار دِن بعد یہ دیکھنے کے لیے کہ اس پہاڑ کے دہانے کے اندر کیا ہے، اُس کی چوٹی پر جا چڑھا۔ یہ جان جوکھوں کا کام تھا لیکن مُجھے جان کی پروا بھی نہ تھی۔ تین گھنٹے کی کٹھن چڑھائی کے بعد میں نے خود کو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے پایا۔ یہ پہاڑ کوئی تین ہفتے سے آگ اُگل رہا تھا۔ میں نے اُس کے دہانے کا ایک چکر کاٹا اور اندر



جھانکا۔ یہ ایک کنواں سا تھا بلکہ کسی چمنی کا پیندا کہیے۔ تھی تو خطرے کی بات لیکن میں خُدا کا نام لے کر دونوں پاؤں جوڑ اندر کُود گیا۔ اس کوشش میں میرا جسم جا بجا سے چھِل بھی گیا اور جل بھی گیا۔ کیوں کہ اس گڑھے کی دیواریں انگارہ سی دہک رہی تھیں۔ مُجھے محسوس ہوا کہ میرے پاؤں اُس بھٹّی کے پیندے پر جا ٹکِے ہیں، یکا یک میرے کانوں نے ایک شورِ بے محابا سُنا جیسے کہیں کوئی بڑا ہنگامہ ہو رہا ہو۔ جب میرے ہوش ذرا بجا ہوئے اور درد بھی کم ہوا تو میں نے چہار طرف نظر ڈالی۔ دیکھتا ہوں کہ اگنی دیوتا وِلکن اپنے کانے دیووں سے لڑ رہا ہے۔ کھانڈے سے کھانڈا بج رہا ہے۔ یہ سِلسِلہ کوئی تین ہفتے سے جاری تھا اور اُسی کی دھمک تھی کہ اُوپر دُنیا میں بھونچال مچا تھا۔ باعث اس لڑائی روک دی اور اگنی دیوتا نے ازراہِ نوازش خود میرے چھالوں اور خراشوں پر مرہم رکھا۔ اِس کے علاوہ طرح طرح کی مٹھائی پھُول پھُلاری اور سوم رَس کے جام سے میری تواضع کی جو صرف دیوی دیوتاؤں کے نصیب کی چیز ہے۔ اس خاطر تواضع کے بعد وِلکن نے زہرہ دیوی کو حکم دیا کہ ہر طرح سے میری خوشنودی کا خیال رکھے۔ مُجھے جو ایوانِ زرّیں اور مکلّف چھپر کھٹ سونے کو دیا گیا اُس کی خوبی اور خوب صورتی کو لفظوں میں بیان کرنا مُمکن نہیں۔ اگنی دیوتا نے بنفسِ نفیس مجھے ماؤنٹ ایٹنا کے بارے میں ساری تفصیلات بتائیں۔ اُس نے کہا یہ پہاڑ تو میری بھٹی کی گِری ہوئی راکھ سے بنا ہے۔ کئی بار میری

رعایا سرتابی کرتی ہے تو میں اُن پر انگارے پھینکتا ہوں۔ وہ پھُرتی سے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں تو انگارے دُنیا والوں پر جا گرتے ہیں۔ اِسی کو تُم لوگ کہتے ہو پہاڑ پھٹ پڑا ہے۔ بعض اوقات یہ لڑائی تین تین چار چار مہینے جاری رہتی ہے۔ ماؤنٹ وساویس بھی میرا ہی کارخانہ ہے جہاں تک ساڑھے تین سو فرسنگ لمبا راستہ سمندر کی تہہ کے نیچے سے جاتا ہے۔ وہاں بھی ایسی ہی آتش فشانی ہوتی ہے۔

میں یہاں بڑا خوش اور آرام سے تھا لیکن لگائی بجھائی کرنے والے کہاں نہیں ہوتے۔ کسی نے ولکن کے کان میں جا کر کہہ دیا کہ زہرہ مُجھ کو دِلچسپی اور مہربانی کی نظر سے دیکھنے لگی ہے۔ اس پر اس کو ایسا تاؤ آیا کہ آگا دیکھا نہ پیچھے ایک چوڑے منہ کے کنوئیں میں پھینک دیا یہ کہتے ہوئے کہ

”اے ناشکرے انسان! جا وہاں جہاں سے تو آیا تھا۔“

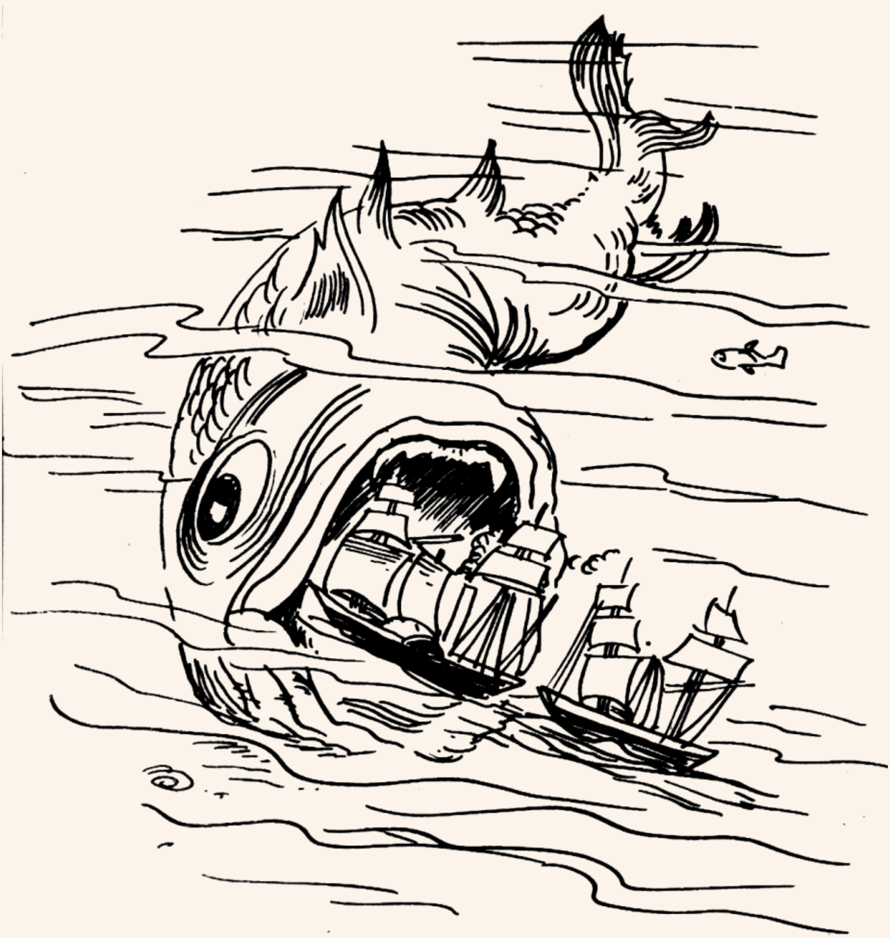
مُجھے تو اس نے بات کرنے کی مہلت بھی نہ دی۔ میں تِیر کی سی تیزی سے کنوئیں میں گِرتا چلا گیا حتّٰی کہ بے سُدھ ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پانی کے ایک بڑے نال میں پڑا ہوں جس پر سُورج کی کرنوں کا لشکارا ہے۔

میں بچپن ہی سے تیراکی کا ماہر ہوں۔ جدھر نظر جاتی تھی پانی ہی پانی تھا۔ گویا میں سمندر میں تھا۔ یہاں سردی بھی بہت تھی۔ یکایک ایک طرف سے ایک پہاڑ سا

تیر تا ہوا اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ برف کا پہاڑ تھا۔ تھوڑی دقّت تو ہوئی لیکن پاؤں جماتا ہوا میں اُس پر جا چڑھا۔ زمین اب بھی دُور دُور تک کہیں نظر نہ آتی تھی۔ قریب شام کُچھ فاصلے پر ایک بادبان نظر آیا تھا۔ میں نے جرمن میں آواز دی، اُدھر سے ڈچ میں جواب آیا۔ میں نے اُوپر سے چھلانگ لگائی اور اُنہوں نے رسّی پھینک کر مُجھے اُچک لیا۔ میں نے پوچھا ہم کہاں ہیں؟ معلوم ہوا بحرِ جنوب میں۔ اب میری سمجھ میں آیا۔ وہ سُوراخ جس میں مُجھے پھینکا گیا تھا دَھرتی کے آر پار گزرتا تھا۔ سیدھے رستے آتے اس جگہ پہنچنے میں مہینوں لگ جاتے۔

میں کُچھ کھا پی کر آرام کرنے کو لیٹ گیا۔ یہ ڈچ لوگ خاصے بد اخلاق سے ہوتے ہیں۔ جب میں نے اُن کو ماؤنٹ ایٹنا سے بحرِ جنوب میں آ کر گِرنے کا قصّہ سُنایا تو ان کے چہروں پر ایسی کیفیت آئی جیسے مُجھے جھوٹا سمجھتے ہوں۔ میں اس وقت ان کا مہمان تھا اس لیے چُپ رہا۔

میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ کہاں کا عزم ہے؟ معلوم ہوا وہ نئے راستے اور نئی ولایتیں دریافت کرنے نکلے ہیں۔ اُنہوں نے کہا اگر تمہاری داستان سچ ہے تو سمجھو ہم کو مراد مل گئی۔ یہ نیا راستہ دریافت کرنے سہرا ہمارے سر رہے گا۔



اگلے روز ہم آسٹریلیا کے جنوب مشرق میں بوٹانی بے میں تھے جہاں کپتان کُک بھی آ کر لنگر انداز ہوا تھا۔ تین دِن یہاں ٹھہرنے کے بعد ہم چلے تو ایک خوفناک طوفان نے ہمیں آلیا۔ ہمارا جہاز اُس کی ضربوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا حتّٰی کہ قطب نما بھی۔ طوفان تھما تو ہم آگے روانہ ہوئے۔ کُچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں جا رہے

ہیں۔ ہم چالیس ناٹ روزانہ کی رفتار سے کوئی چھ مہینے یونہی چلتے رہے۔ حتّٰی کہ ایک ایسے خطّے میں پہنچ گئے جہاں چہار طرف سے خوشبو ہی خوشبو آ رہی تھی۔ پانی کا رنگ بھی سبز سے سفید ہو گیا تھا۔ اس کے کُچھ دیر بعد خُشکی نظر آئی اور ہم جہاز سمیت ایک آبنائے سے کوئی ساٹھ فرسنگ اس کے اندر چلے گئے۔ دیکھا کہ یہ ایک خلیج ہے جس میں پانی کی بجائے خالص اور لذیذ دُودھ بہہ رہا ہے۔ یہاں ہم اُترے تو معلوم ہوا کہ یہ جزیرہ بجائے خود پنیر کا بنا ہوا تھا۔ یہاں کی آبادی بس اُسی پر گزارہ کرتی ہے۔ جتنا یہ دِن بھر میں کھاتے ہیں، اگلے روز اتنا اور ہو جاتا ہے، کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہاں بیلیں بھی تھیں جن پر بڑے بڑے انگور لگے تھے۔ ان کو توڑو تو اُن کے اندر سے بھی دُودھ نکلتا تھا۔ یہاں کے باشندے دُودھ کی سطح پر دوڑتے پھرتے تھے۔ نو نو فٹ لانبے، ہر ایک کی تین ٹانگیں ایک بازو۔ بہر حال بھلے لگتے تھے۔ ان کی پیشانیوں پر ایک سینگ نکلا ہوتا ہے بس اُس سے لڑتے ہیں۔ دودھ میں یہ ڈوبتے نہیں تھے اُس کی سطح پر چلتے تھے جیسے ہم سبزے پر چلتے ہیں۔ پنیر کے اس جزیرے پر مکئی بہت عمدہ اُگتی ہے۔ یہاں دُودھ کے سترہ اور دریا ہم نے دیکھے اور دس دریا شراب کے۔

اڑتیس دِن کے سفر کے بعد ہم دوسرے کنارے پر پہنچے یہاں طرح طرح کے پھلوں کے پیڑ تھے جن میں سے بعض ہم نے پہلی بار دیکھے۔ ان بڑے بڑے

درختوں میں کُچھ گھونسلے بھی دیکھے۔ ایک گھونسلا شاہ رُخ پرندے کا بھی تھا جس کی جسامت کا گھیر لندن کے سینٹ پال گرجا کے گنبد سے دُگنا بڑا ہو گا۔ گھونسلا ٹہنیوں کا نہیں بلکہ جھاڑیوں اور درختوں کی بڑی بڑی شاخوں کو آپس میں جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اس گھونسلے میں پانچ سو سے زیادہ انڈے تھے، بہت بڑے بڑے جن کے اندر ہم بچّوں کے کھُد بُد سُن سکتے ہیں۔ ہم نے بڑی مُشکل سے ایک انڈے کو توڑا اور اس میں سے ایک بچّہ نکلا جس کے پَر تو ابھی نہیں نکلے تھے لیکن جُثّہ بیس بڑے گدھوں کے برابر ہو گا۔ ابھی ہم اس بچّے کو دیکھ ہی رہے تھے کہ اس کا باپ یعنی شاہ رُخ آ نکلا۔ چوں کہ ہمارے جہاز کا کپتان انڈے کو توڑنے میں پیش پیش تھا اس لیے اس نے اس کی اپنی چونچ میں اُٹھایا اور اُڑتا ہوا ایک میل اُونچائی پر پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے کپتان صاحب کو سمندر میں گرا دیا لیکن گرانے سے پہلے پنکھ مار مار کر اُس کی بتیسی نکال دی۔

یہ ولندیز لوگ سخت جان ہوتے اور پیراک اچھّے ہیں۔ چناں چہ یہ کپتان تیرتا ہوا جلد ہی ہم سے آ ملا اور ہم جہاز پر واپس آ گئے۔ اب کے ہم نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا اور عجیب عجیب چیزیں دیکھیں۔ ہم نے ایسے سانڈ دیکھے جن کی پیشانیوں سے ایک مہیب سینگ باہر نکلا ہوا تھا۔ دونوں آنکھوں کے درمیان میں سے۔ ہم نے سب کو مار دیا اگرچہ بعد میں افسوس بھی ہوا یہ معلوم کر کے یہ تو بڑے مسکین

ہیں، ان پر سواری کر سکتے ہیں، گاڑی میں جوت سکتے ہیں اور ان کا گوشت بھی لذیذ ہوتا ہے۔ لیکن لوگ کھاتے نہیں کیوں کہ لوگوں کی خوراک دُودھ اور پنیر ہے۔ یہاں سے دو دِن کی راہ پر ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ تین آدمی ایک اُونچے درخت پر اُلٹے ٹنگے ہوئے ہیں۔ ہم نے پوچھا اُنہوں نے کیا قصور کیا جو یہ سزا ملی؟ پتہ چلا کہ یہ سیاح تھے جنہوں نے سفر سے واپسی پر جھوٹی داستانیں سُنائی تھیں۔ جو مقام اور چیزیں نہیں دیکھی تھیں، ان کے بھی قصّے گھڑ رکھے تھے۔ میں کہا شکر خدا کا کہ میں نے کبھی راست گوئی سے انحراف نہیں کیا۔ اس جزیرے کے درخت عجیب و غریب تھے۔ ہم جب لنگر اُٹھا کر چلے۔ اُنہوں نے جھک جھک کر ہمیں سلامی دی اور پھر سیدھے کھڑے ہو گئے۔

ہمارے پاس قطب نما تو تھا نہیں لہٰذا اٹکل سے سفر کرتے ہوئے تین ماہ بعد ہم ایک ایسے سمندر میں پہنچے جس کا پانی سیاہ تھا۔ چکھنے پر معلوم ہوا کہ نہایت عمدہ شراب ہے۔ جہازیوں کو بڑی مُشکل سے روکا کہ زیادہ نہ پئیں۔ چند گھنٹے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ وہیل مچھلیوں اور دوسرے دیو پیکر جانوروں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال دیا ہے۔ ایک جانور تو اتنا بڑا تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اُس نے سانس کھینچا اور ہمارا جہاز مع مستولوں اور بادبانوں کے اس کے مُنہ میں چلا گیا۔ اس کے دانت ہی ہمارے مستولوں کے برابر بڑے تھے۔ اب اس نے پانی کا گھونٹ بھرا اور ہمارا جہاز جو پانچ

سو ٹن وزنی تھا تیر کر اس کے شکم میں چلا گیا۔ یوں لگتا تھا ہم کسی ساکت سمندر میں آ کر لنگر انداز ہو گئے ہیں۔ یہاں کی ہوا ذرا گرم اور بُو دار تھی۔ ہم نے دیکھا کہ اور بہت سے جہاز کُچھ خالی کُچھ سامان سے لدے اور بے شمار کشتیاں ہم سے پہلے اس جگہ لنگر انداز ہیں۔ یہاں سُورج یا چاند کی روشنی کا گزر نہ تھا سارا کام مشعلوں سے چلتا تھا۔ جب وہ جانور پانی پیتا تھا ہمارا جہاز تیرنے لگتا تھا ورنہ تہہ نشین ہو جاتا تھا۔ میرا اندازہ ہے اس کے ایک گھونٹ میں اتنا پانی آتا تھا جتنا جھیل جنیوا میں ہے حالاں کہ وہ کوئی تیس میل کے گھیر میں ہے۔

دوسرے دِن جب کہ ہمارا جہاز تہہ میں بیٹھا تھا میں کپتان اور کُچھ دوسرے آدمیوں کو لے کر مشعل بدست نکلا۔ یہاں ہمیں دُنیا کی تمام قوموں کے کوئی دس ہزار آدمی ملے۔ بعض تو کئی سال سے وہاں تھے۔ انہی میں بچّے بھی تھے جو یہیں پیدا ہو کر بڑے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے باہر کی دُنیا دیکھی ہی نہیں تھی۔ ایک روز سب لوگوں نے میٹنگ کی یہ طے کرنے کے لیے کہ کیسی اس قید سے رہائی پائیں۔ ابھی جلسہ شروع نہ ہوا تھا کہ اس جانور نے پھر پانی پی لیا اور ہم پانی میں شرابور اپنے جہازوں کی طرف بھاگے۔ بڑی مُشکل سے جان بچائی۔ پانی اُترا تو پھر جلسہ ہوا۔ اب کے مُجھے جلسے کا صدر بنایا گیا اور میں نے یہ تجویز کیا کہ اب کے یہ جانور مُنہ کھولے تو دو مستول اس میں اَڑا دیے جائیں تا کہ دوبارہ منہ بند نہ کر سکے۔ اس کام کے لیے سو

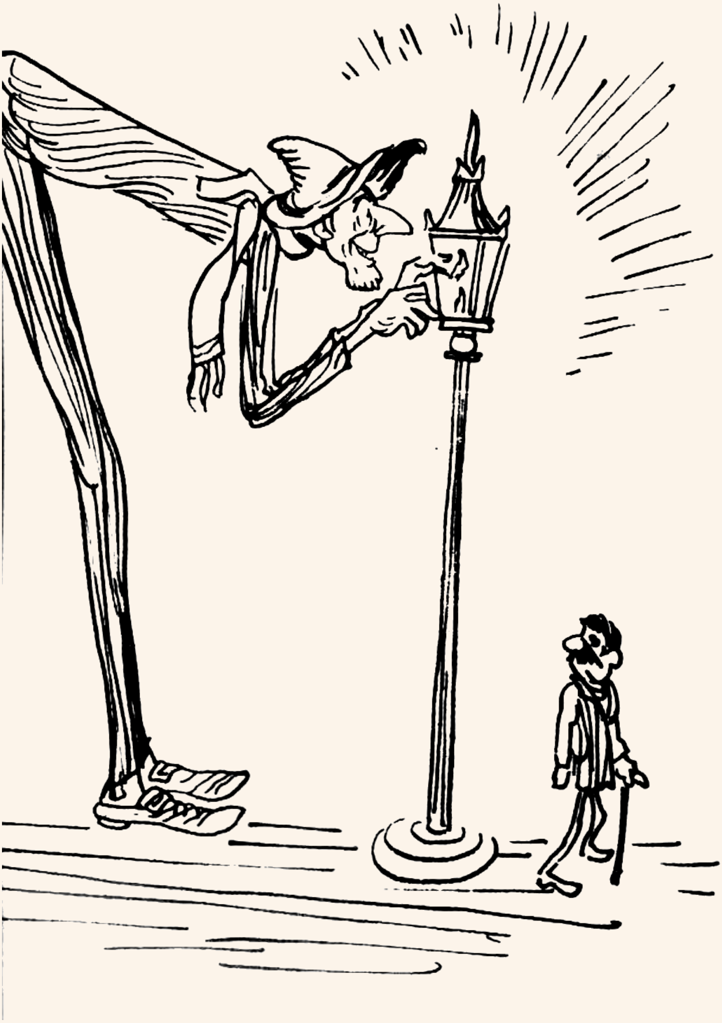
قوّی اور جسیم آدمی چُنے گئے۔ جُونہی اس سمندری دیو نے منہ کھولا مستولوں کا ایک سرا تالو میں اٹکا دیا گیا اور دوسرا سر زبان چیر کر قائم کیا گیا۔ یوں ہم نے اپنے جہازوں اور کشتیوں کو نکالا اور تین مہینے اس ظلمات میں بسر کرنے کے بعد سُورج کا منہ دیکھا۔ باہر نکل کر ہم نے گنا، پورا جہازوں کا بیڑا تھا یعنی پچانوے جہاز تھے، تمام قوموں کے ملا کر۔

مستولوں کو تو ہم نے اس سمندری عفریت کے منہ ہی میں چھوڑا تاکہ کوئی اور ہماری طرح اسیر ظُلمات نہ ہو جائے۔ اب ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ہم ہیں کہاں؟ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ بحیرہ کیسپین میں جو تاتاریوں کی سرزمین میں واقع ہے۔ سوال یہ تھا کہ یہاں پہنچے کیسے؟ کیوں کہ اِس سمندر کا تو کسی اور سمندر سے کوئی تعلق نہیں، الگ تھلگ واقع ہے۔ آخر جزیرہ پنیر کے ایک آدمی نے جسے میں ساتھ لایا تھا، بتایا کہ یہ عِفریت کسی زمین دوز خفیہ راستے سے ہمیں بڑے سمندر سے یہاں لے آیا ہے۔ خیر ہم ساحل پر پہنچے اور سب سے پہلے اُترنے والا آدمی میں تھا۔ جُونہی میں نے قدم زمین پر رکھا ایک بہت بڑا بھالو مُجھ پر جھپٹ کر آیا۔ میں نے اس کو اپنی مُٹھّی میں لے کر ایسا بھینچا کہ وہ درد سے چلّانے لگا۔ لیکن میں نے بھی چھوڑا نہیں جب تک وہ بھُوک سے مر نہیں گیا۔ حضرات آپ ہنسیے نہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ میں نے اس کو اپنے پنجے میں چاٹنے نہیں دیے۔ یہاں سے میں دوبارہ سینٹ پیٹرز برگ

پہنچا، جہاں ایک پرانے دوست نے مجُھے ایک عمدہ کھوجی کُتّا دیا جو اس مشہور کُتّیا کی نسل سے تھا جس نے خرگوشنی کا تعاقب کرتے ہوئے بچّے جنے تھے۔ افسوس اس اناڑی شکاری کی گولی لگنے سے یہ مر گیا۔ اس کی پوستین سے میں نے یہ صدری بنائی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے پہن کر نکلتا ہوں تو صدری کا ایک بٹن اُڑ کر وہاں جا گرتا ہے جہاں شکار بیٹھا یا چھُپا ہوتا ہے۔ بَس فیر کیا اور اُس کو لے لیا۔ افسوس اب اس صدری میں صرف تین بٹن رہ گئے ہیں۔ شکار کے موسم میں اور بٹن لگوانے پڑیں گے۔

یہ بٹن تیتروں کے جھنڈ پر گرے تو وہ ایک قطار میں اُوپر اُٹھتے ہیں۔ ایک کے پیچھے ایک۔ ایک روز میں بارُود ٹھونکنے کی سلاخ باہر نکالنا بھول گیا اور بندوق کا فیر کر دیا۔ میں اس میں گولی ڈالنا بھول گیا تھا۔ بارُود سے یہ سلاخ تپ کر لال ہو گئی اور میرے گھر پہنچنے تک سارے تیتر خود بخود بھُن گئے تھے۔ انگلستان واپس پہنچ کر میں نے جزیرہ پنیر کے آدمیوں کو کسی نہ کسی کام پر لگا دیا۔ میں اپنے پرانے دوست سر ولیم چیمبرز سے ملا تو اس نے اپنی مشکل یہ بیان کی کہ سمرسٹ ہاؤس کی بلڈنگ میں جو نئی بنی ہے، لالٹینیں جلانے کا انتظام تسلّی بخش نہیں۔ سیڑھی لگا کر اُن کو روشن کرنے کا طریقہ گندا بھی ہے مشکل بھی، میں اپنے ساتھ جزیرہ پنیر سے جو خدمت گار لایا تھا وہ پہلے صرف نو فٹ کا تھا لیکن اب بڑھ کر ساڑھے دس فٹ کا ہو گیا تھا۔ اسے میں

نے سر ولیم چیمبرز کی نذر کر دیا اور یہ شخص زمین پر کھڑے کھڑے عمدگی سے لالٹین جلا دیتا ہے۔



ختم شد